دوسروں کی ہم سے توقعات:

پھر ایک توقع وہ ہوتی ہے جو دوسروں کو ہم سے ہوتی ہے۔ اس حوالے سے محتاط رہنے کی ضرورت ہے، یہ تھوڑا نازک معاملہ ہے۔ جب دوسرے ہم سے توقعات لگاتے ہیں تو ان کا کس حد تک خیال رکھا جائے، کتنی اہمیت دی جائے۔ اس معاملے میں ''شریعت'' اور ''فطرت'' دونوں انسان کی رہنمائی کرتی ہیں۔ جہاں تک شریعت نے اجازت دی ہے، وہاں دوسروں کی خواہشات کا احترام کیا جائے، یعنی والدین، شوہر یا بیوی کی، اولاد، بھائی بہن یا دیگر قرابت داروں کی توقعات کی رعایت رکھنی چاہیے، کیوں کہ دوسروں کی توقعات پر پورا اترنے سے تعلقات خوش گوار ہوتے ہیں لیکن اگر کوئی غیر منطقی توقع ہے یا شریعت کے خلاف ہے تو یہ پوری نہیں کی جاسکتی۔ سورۃ العنکبوت میں اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ:

{وَاِنْ جٰهَدٰكَ لِتُشْرِكَ بِيْ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ فَلَا تُطِعْهُمَا} (العنکبوت:۸)

''(تو والدین کی اطاعت کر) لیکن اگر وہ یہ تجھے مجبور کریں کہ تو اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرائے تو ان کا کہنا نہ ماننا۔''

یہ توقع شریعت کے خلاف ہے۔ شریعت کے خلاف توقعات تو پوری کی ہی نہیں جاسکتیں۔ اس کے سوا جس حد تک استطاعت ہو، بس میں ہو، دوسروں کی جائز توقعات کو پورا کرنا نیکی ہے، اس کا اجر ہے، یہ احسان کا درجہ ہے۔ ایک تو ہے لوگوں کا حق ادا کرنا یہ تو فرض کا درجہ ہے، یہ تو کرنا ہی کرنا ہے، نہیں ادا کریں گے تو گناہ گار ہوں گے۔ اور دوسرا یہ کہ کسی حق سے بڑھ کر دینا، یہ توقعات پر پورا اُترنا ہوا، اوروں کی توقعات پر پورا اُترنے والا محسن بن جاتا ہے۔ یہ احسان کی روش انسانوں کے ساتھ اختیار کرنا چاہیے۔ انسانوں کو حتی الامکان حق سے بڑھ کر دیں، ان شاء اللہ تعالیٰ اس کا بہت اجر ملے گا۔

دوسروں سے کچھ کرنے کی توقع:

توقع کا ایک رخ یہ ہے کہ انسان کسی نیکی کے بدلے دوسروں سے توقع رکھے کہ وہ میرے لیے کچھ کریں گے۔ یعنی اگر انسان کسی کے ساتھ نیک سلوک کر دے تو یہ توقع لگالے کہ اب وہ بدلے میں میرے لیے اس سے بڑھ کر کوئی کام کرے گا، یہ بھی ایک طرح کی فقیری ہے۔ دوسروں سے کچھ ملنے کا منتظر رہنا۔ دیکھیں، ہاتھ پھیلانے والا تو ہاتھ پھیلانے والا ہی ہے، چاہے وہ پیسے کے لیے ہاتھ پھیلائے یا کسی اور مدد کے لیے ہاتھ پھیلائے۔ نبی اکرم ﷺ نے ہمیں ایک قاعدہ دیا ہے کہ

((اَلْيَدُ الْعُلْيَا خَيْرٌ مِنَ الْيَدِ السُّفْلٰى)) (۱)

''اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہے۔''

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب بیان ان الید العلیا خیر ---

تو تم دینے والے بنو لینے والے نہ بنو، خود کو دوسروں کا محتاج مت کرو۔ دوسروں سے توقعات لگانے کا نقصان کیا ہوتا ہے۔ اب اس میں دو ہی احتمال ہیں، یا تو کوئی ہماری توقع پر پورا اُترے گا یا توقع پر پورا نہیں اترے گا۔ تیسری تو کوئی صورت ہے ہی نہیں۔ اِن دونوں صورتوں میں ہمارا ہی نقصان ہے۔ توقع پر پورا اُترتے ہیں تو بھی نقصان، اور نہیں اُترتے تو بھی گھاٹا۔ وہ کس طرح سے؟ یوں کہ اگر ہم نے کسی سے توقع لگائی اور وہ پوری ہوگئی تو اُس کا احسان نہیں مانیں گے، قبول (acknowledge) نہیں کریں گے اور سراہیں گے نہیں، بلکہ سوچیں گے کہ ان کو تو ایسا ہی کرنا چاہیے تھا، ہم ان سے یہی اُمید (expect) لگائے ہوئے تھے۔ خاص طور پر ہمارے ہاں سسرالی رشتوں میں یہ چیز بہت پائی جاتی ہے۔ اگر ساس نے بہو سے توقع لگائی کہ وہ میرے ساتھ اچھا سلوک کرے گی، خدمت گزار ہوگی اور اگر وہ یہ کر دکھاتی ہے تو ساس کہتی ہے اس کو ایسا ہی کرنا چاہیے تھا، کون سا بڑا کام کیا۔ نہ اس کی تعریف کرے گی اور نہ اس کا احسان مانا جائے گا۔ تو فائدہ کیا ہوا! تعلقات بہتر تو نہ ہوئے۔

کچھ لوگ اپنی توقع کو دوسروں پر فرض کر دیتے ہیں، توقعات کو توقعات نہیں سمجھتے، اگلے کا احسان نہیں جانتے۔ سمجھتے ہیں یہ تو اس کا فرض تھا، اس کو یہی کرنا چاہیے تھا تو اس سے کوئی بہتری نہیں آتی۔ اور اگلے کے اوپر یہ چیز بوجھ بنتی چلی جاتی ہے۔ کیوں کہ اس نے تو اپنی طرف سے کوئی اضافی کام خوشی خوشی کیا تھا، اب تو وہ پچھتائے گا کہ لو، یہ تو اب مجھ پر فرض ہی ہوگیا، یہ تو اب مجھ پر پابندی لگادی کہ میں ایسا ہی کرتا رہوں۔ یہ بات تو سامنے والے کی پریشانی کا باعث بنتی ہے اور اگر پھر وہ ہماری توقعات پر پورے نہیں اُترتے تو شکایتیں اور بدمزگیاں پیدا ہوتی ہیں۔

ایک اور بات یاد رکھیں جب ہم کسی سے توقعات بڑھاتے ہیں تو وہ بھی ہم سے توقعات بڑھاتے ہیں۔ پھر وہ بھی صرف حق پر راضی نہیں رہتے۔ بلکہ اپنی بہت ساری خواہشات کو اپنا حق سمجھنے لگتے ہیں۔ مثال کے طور پر کسی کے ہاں کوئی خوشی کی تقریب ہوئی اب توقع رکھی جاتی ہے کہ سب لوگ بخوشی مبارک باد دینے آئیں گے۔ بعض دفعہ لوگ ڈر کی وجہ سے بھی جاتے ہیں، ان کا دل بالکل نہیں چاہ رہا ہوتا مگر ان کو پتہ ہوتا ہے کہ اگر نہیں گئے تو شامت آجائے گی۔ بادلِ نخواستہ چلے جاتے ہیں۔ اب جب اُن کے ہاں کوئی خوشی کی تقریب ہوگی اور کوئی اُن سے معذرت کرلے تو جواب ہوگا ہم بھی تو آپ کے ہاں آئے تھے، آپ کیوں نہیں آئے؟ اس طرح ہم دوسروں سے توقعات بڑھا بڑھا کر اپنی زندگیاں بوجھل بنا دیتے ہیں۔ اگر ہم چاہتے ہیں کہ ہماری زندگی ہلکی رہے، کوئی ہم سے بہت امیدیں نہ لگائے تو پہلا کام یہ کریں کہ خود دوسروں سے توقعات وابستہ نہ کریں۔ کسی نے کوئی بھلائی کردی تو اچھی بات ہے، نہیں کی تو کوئی گلہ شکوہ نہیں۔ یہ رویّہ کہ میں نے فلاں کے ساتھ اتنا کیا، لیکن میرے مشکل وقت میں کسی نے ساتھ نہیں دیا، میں نے فلاں کا یہ کام کیا

مگر اُس نے شکریہ کے دو بول بھی نہیں بولے۔ یہ اُمیدیں ہماری زندگی میں تلخیاں پیدا کرتی ہیں۔

رشتہ داروں کا خیال بلا توقع اللہ کے لیے رکھا جائے:

مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے ''اصلاحی خطبات'' میں رشتہ داروں کے بارے میں لکھا ہے کہ رشتہ داروں کا خیال محض اللہ کی خاطر رکھو۔ یہ سوچ کر اچھا سلوک مت کرو کہ یہ میرے گُن گائے گا یا میرا شکریہ ادا کرے گا یا پھر میری تابعداری کرے گا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ نیک عمل کرنے کے باوجود خوشی حاصل نہ ہوگی۔ اب اگر ہم بہوؤں کی بات کریں تو وہ بھی یہی چاہتی ہیں کہ ساس ہر جگہ ان کے گُن گائیں، قدم قدم پر شکریہ ادا کریں اور جب ایسا نہیں کیا جاتا تو ذمہ داریاں تو پھر بھی ادا کرنا پڑتی ہیں لیکن دلی آمادگی کے بغیر، مارے بندھے، جس سے کوئی خوشی نہیں ملتی۔ اس لیے کہ اپنے آپ کو بلاوجہ دوسروں کی تعریف کا محتاج بنایا۔ اگر محض اللہ کی خاطر کریں تو اللہ کے ہاں تو بلاحساب اجر ہے اور دنیا میں بھی بندہ خوش اور مطمئن رہے گا۔ ورنہ جل جل کر، کُڑھ کُڑھ کر، رو رو کر زندگی گزرے گی کہ ہمیں صلہ نہیں ملتا، بدلہ نہیں ملتا۔ یہ ایسا ہی ہے کہ ایک فقیر دوسرے فقیر سے کچھ مانگے۔ بھلا ایک فقیر کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ تو کیوں نہ بادشاہ سے مانگیں جو دینے والا ہے۔

ایک شخص کا واقعہ آتا ہے کہ کسی نے اس کو بتایا کہ فلاں بادشاہ بہت سخی ہے، ہر ایک کو نوازتا ہے، تمہاری حاجتیں بھی پوری کرے گا، یہ سن کر وہ شخص بادشاہ کے پاس اپنی حاجتیں لے کر پہنچ گیا۔ جب وہاں گیا تو دیکھا کہ بادشاہ جائے نماز پر بیٹھا ہے اور ہاتھ پھیلا کر اللہ سے مانگ رہا ہے۔ یہ دیکھ کر وہ شخص دروازے ہی سے واپس آ گیا۔ اُس نے سوچا جب یہ خود کسی کے آگے ہاتھ پھیلا رہا ہے، خود کسی کا محتاج ہے تو میں کیوں اس سے مانگوں۔ میں اُسی سے کیوں نہ مانگوں جس سے یہ بادشاہ مانگ رہا ہے۔ کاش کہ ہم یہ نکتہ سمجھ لیں تو ہماری زندگیاں کتنی آسان ہو جائیں۔ اپنی ذمہ داریاں ادا کریں، لوگوں کے ساتھ احسان کریں، ان کی توقعات پر پورے اتریں لیکن محض اللہ کی رضا کی خاطر!

مفتی صاحب آگے لکھتے ہیں کہ ہمارے معاشرے کی غلط فکر کی وجہ سے عربی زبان کی ایک مثل مشہور ہوگئی کہ رشتہ دار بچھو جیسے ہیں، ہر وقت ڈنک مارنے کی فکر میں رہتے ہیں، کبھی راضی نہیں ہوتے۔ یہ مثل اس لیے مشہور ہوئی کہ رشتہ داروں کے ساتھ حسنِ سلوک اس توقع کے ساتھ کیا گیا کہ ان کی طرف سے اچھا برتاؤ ہوگا، لیکن جب توقع کے مطابق حسنِ برتاؤ نہ ملا تو پھر وہ بچھو ہو گئے، اب بُرے لگنے لگے۔ اسی طرح ساس سے یہی شکوہ رہتا ہے کہ وہ تو تعریف ہی نہیں کرتی، سسرال والے تو تعریف ہی نہیں کرتے، اگر کوئی بہو اپنی ساس یا نندوں کے ساتھ اچھا سلوک کرتی ہے تو شوہر

کو جا جا کر جتلاتی ہے تا کہ وہ تعریف کریں۔ اور اگر شوہر تعریف نہ کرے تو دل چھوٹا کر کے بیٹھ جاتی ہے۔ یہ سراسر حماقت ہے، خواتین کو چاہیے کہ وہ اپنا وقار (dignity) قائم رکھیں۔

دنیا میں راحت سے رہنے کا ایک ہی نسخہ: مخلوق سے توقعات نہ رکھنا

دنیا میں راحت سے رہنے کا صرف ایک ہی نسخہ ہے۔ ہم چاہتے ہیں کہ ہماری زندگی میں سکون (tranquility) ہو۔ یہ آزمایا ہوا نسخہ ہے کہ مخلوق سے توقعات ختم کر دیں، مثلاً فلاں شخص میرے کام آئے گا، میرے ساتھ اچھا کرے گا، فلاں شخص میرے دُکھ درد، میری پریشانی و مشکل میں شریک ہوگا، میری مدد کرے گا۔ صرف اللہ تبارک وتعالیٰ سے توقعات رکھیں۔ تو پھر اگر مخلوق کی طرف سے کوئی اچھائی ملے گی تو وہ خلافِ توقع ہوگی اور اس سے بہت خوشی ہوگی اس لیے کہ آپ توقع نہیں کر رہے تھے۔ اور اگر مخلوق کی طرف سے کوئی تکلیف پہنچے تو زیادہ رنج نہیں ہوگا اس لیے کہ اچھائی کی توقع تو پہلے بھی نہیں تھی، اس لیے صدمہ اور رنج زیادہ نہ ہوگا۔ ہم جو کہتے ہیں کہ مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی، تم سے اس کی توقع نہیں تھی، تمہارے اس سلوک سے بہت دکھ ہوا، اس طرح کی باتیں کہنا چھوڑ دیں۔ اچھائی کی توقع کے بغیر جو خوشی مل جائے وہ اضافی (bonus) خیر ہے۔

والدین کی اولاد سے بے جا توقعات:

اسی طرح والدین بھی اولاد سے بہت زیادہ توقعات قائم کر لیتے ہیں اور پھر اپنے بچوں کی قدر نہیں کر پاتے۔ جو بچے اپنی ذمہ داریاں احسن طریقے سے پوری کر رہے ہوتے ہیں اُن سے بھی ناراض رہتے ہیں۔ کیوں کہ اکثر لوگ غیر حقیقی توقعات لگا بیٹھتے ہیں۔ ہم چاہتے ہیں کہ بچوں کی زندگی کا مرکز و محور ہماری ذات بن جائے لیکن یہ کیسے ممکن ہوسکتا ہے۔ ان کی اپنی زندگیاں ہیں، اپنے مسائل، اخراجات، پریشانیاں، دوست احباب اور رشتہ داریاں ہیں تو ان سے اتنی توقعات لگانے سے کچھ فائدہ تو ہوتا نہیں، اُلٹا نقصان ہی ہوتا ہے کہ ماں باپ بچوں کی قدر نہیں کر پاتے۔ بچے جو بھی کریں والدین کو کم ہی لگتا ہے، توقعات کا اظہار شکایتوں کی شکل میں ہوتا ہے، پژمردگی (depression) کا شکار ہو جاتے ہیں، بیمار پڑ جاتے ہیں۔

نہ شکریہ مانگو نہ شکایت کرو:

بعض لوگ اچھے گھروں میں رہ رہے ہوتے ہیں، اچھا کھانے کو ملتا ہے، معاشرے کے اندر عزت ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نیک بیوی دی، یا اچھا شوہر دیا، یا پھر صالح اولاد دی، مگر کسی نعمت کا احساس نہیں ہوتا کیوں کہ توقع کے مطابق نہیں ملا۔ کتنی ناشکری اور اپنے آپ کو اذیت دینے والی بات ہے۔ خود اپنی شخصیت کچل کر رکھ دیتے ہیں، خود کو دوسروں کا محتاج کرتے ہیں۔ اس کا علاج یہ

ہے کہ فیصلہ کرلیں کہ ایک ہفتہ تک کوئی شکایت نہیں کرنی۔ نوکر نہیں آیا، پانی نہیں آیا، بجلی یا گیس ختم ہوگئی۔ ساس نے شکریہ نہیں کہا، نند نے گھر کے کام میں مدد نہیں کی، یہ سب شکایتیں ایک ہفتہ کے لیے چھوڑ دیں۔ ان شاءاللہ تعالیٰ اللہ کی مدد سے توقعات سے چھٹکارا مل جائے گا۔ اپنی ذمہ داری اور فرائض پوری طرح ادا کریں، سستی کا مظاہرہ نہ کریں۔ اگر شکریہ کے لیے فرائض اور ذمہ داریاں ادا کیں تو دنیا میں شکریہ کی صورت میں صلہ پالیا، پھر اللہ کے ہاں اجر نہیں ہوگا۔ قرآن میں آتا ہے کہ:

{اِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللّٰهِ لَا نُرِيْدُ مِنْكُمْ جَزَآءً وَّلَا شُكُوْرًا} (الدھر: ۹)

(''نیک لوگوں کا حال تو یہ ہوتا ہے) ہم تو کھلاتے ہیں تم کو اللہ کی خاطر، ہم تم سے نہ بدلہ چاہتے ہیں نہ شکر چاہتے ہیں۔''

ہم اپنی ذات کی بڑائی کے لیے نیک سلوک نہیں کرتے، ہم اللہ کی رضا اور خوشی حاصل کرنے کو یہ نیکیاں کرتے ہیں تو دوسروں کا شکریہ اور دعا (جزاک اللہ) زیادہ سے زیادہ دیا کریں اور دوسروں کے احسانات کو یاد رکھیں۔

خواتین کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جب وہ رشتوں کے انتظار میں بیٹھی ہوئی تھیں تو کتنی پریشان ہوتی تھیں۔ اب اللہ نے شوہر دیا، اپنا گھر دیا تو شکر نہیں کرتیں، قدر نہیں کرتیں۔ اور ذرا سوچیں کہ جن چیزوں کی شکایت کرتی ہیں وہ کتنی بے ضرر ہوتی ہیں۔ کوئی ساس کوڑے لے کر مار پیٹ نہیں کرتی، نہ بھوکا پیاسا رکھتی ہے، نہ شوہر سے ملنے سے روکتی ہے، کوئی بھی ایسی نہیں، بس چھوٹی چھوٹی باتوں پر نوک جھونک ہوتی ہے تو سوچیں اس سے بہتر متبادل (alternate) کیا تھا؟ اگر آج تک گھر بیٹھی رہتی تو اچھا تھا؟ تو کیا وہ زندگی بہتر ہوتی؟ پُرسکون ہوتی؟ جب اللہ تعالیٰ نے ارمان پورے کردیئے تو وہ کافی نہیں لگتا۔ اگلے گھر آتے ہی بہت سی توقعات لگالیتی ہیں۔

جب احسانات کو یاد رکھتے ہیں تو دل کے اندر جگہ بنتی ہے۔ اور اگر کدورت آرہی ہے تو اس بندے کو چاہیے کہ جس سے گلہ شکوہ پیدا ہورہا ہے اس کو تحفہ دیں، اس کے ساتھ وقت گزاریں۔ جب توقع پوری نہیں ہوتی تو ہم کھنچ جاتے ہیں، پیچھے ہٹ جاتے ہیں، اس سے دُوری پیدا ہوجاتی ہے۔ تو آپ اپنی طرف سے اپنے مقام پر قائم رہیے، آپ کو پیچھے ہٹنے کی ضرورت نہیں، احسان کی روش پر قائم رہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے، ''اللہ تو محبت کرتا ہے محسنوں سے''، جس سے اللہ محبت کررہا ہے اس کو کسی کی محبت کا رونا رونے کی ضرورت نہیں۔

جن توقعات کو پورا کرنے کے نتیجے میں یعنی احسان کے نتیجے میں اللہ جنت جیسی نعمت دے رہا ہے

تو پھر کسی اور سے کیا شکریہ چاہیے؟ کیا بدلہ مطلوب ہے؟ اور انسان یہ بھی یاد رکھے کہ کس کس موقع پر میں دوسروں کی توقعات پر پورا نہیں اُترا۔ ہمیں یہ تو یاد ہی نہیں رہتا لیکن اگر دوسرے ممنون نہ ہوں تو ہماری انا پر چوٹ لگتی ہے یہ بھی بیمار انا کی نشانی ہے۔ یاد رکھیں کہ میں کب کب لوگوں کی توقعات پر پورا نہیں اُترا۔ یہ تو ناممکن ہے کہ کوئی انسان سب کی توقعات پر پورا اتر جائے، ماں باپ، بہن، بھائی، شوہر، سسرال، اولاد، انسان کے اندر کتنی کمی ہے یہ بات یاد رہے گی تو دوسروں کی کمزوری کا بھی احساس رہے گا۔ اب توقعات بعض دفعہ بہت بڑھ جاتی ہیں۔ رشتہ جتنا قریبی ہوتا ہے توقعات اتنی ہی زیادہ ہوتی ہیں۔ بعض دفعہ رشتہ بہت ہی قریبی ہوجائے مثلاً شوہر بیوی کا، تو بیوی کی توقع ہوتی ہے کہ بغیر کہے شوہر جان لے کہ میں کیا چاہتی ہوں۔ کہنا کچھ نہیں بس ان کو سمجھنا چاہیے تھا کہ میں کیا چاہ رہی تھی یہ تو انتہائی غیر حقیقی توقع ہے۔ ہر شخص تو ایسا مزاج شناس نہیں ہوتا کہ چہرے کے تاثرات کو سمجھ جائے کہ دل و دماغ میں کیا چل رہا ہے جیسے سر میں درد ہے منہ سے نہیں کہوں گی خود شوہر میری تکلیف کو سمجھ جائے اور دوائی لادیں۔ پھر غصہ آتا ہی رہے گا، کسی کو میرا احساس نہیں، قدر نہیں۔ یہ چھوٹی چھوٹی غیر حقیقی توقعات ہیں جو لوگ رکھتے ہیں۔

نبی اکرم ﷺ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ نصیحت فرمائی تھی کہ

((لاتسئل الناس شیئا))[1]

''تم لوگوں سے کچھ نہ مانگنا۔''

ان صحابہ رضی اللہ عنہم کا حال یہ ہوگیا تھا کہ اگر گھوڑے پر بیٹھے ہوئے ہاتھ سے کوڑا یا چابک گر جاتا تو ارد گرد کھڑے لوگوں سے نہیں کہتے تھے بلکہ خود اُتر کر چابک اُٹھاتے تھے، خود ہی سارے کام کیا کرتے، اتنی بھی توقع نہ رکھی کہ اتنا چھوٹا کام بھی کسی سے کروالیں۔ تو حقیقت ہے کہ یہ خوش رہنے کا بہترین نسخہ ہے۔ اس میں انسان متحرک (active) رہتا ہے، ذہنی طور پر پُرسکون (relax) رہتا ہے، اپنے آپ کو مظلوم نہیں سمجھتا، اس کو پتہ ہوتا ہے کہ میرا رب سب دیکھ رہا ہے۔ ساری توقعات اللہ سے لگا لیجیے، اللہ آپ کو آپ کی توقعات سے بڑھ کر دے گا۔ اللہ سے آپ جو بھی توقع لگائیں گے وہ حقیقی (realistic) ہوں گی جب کہ انسانوں سے لگائی گئی توقعات بعض دفعہ غیر حقیقی ہوجاتی ہیں تو یہ تکلیف کا، صدمے کا سبب بنتی ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق دے کہ ہم دوسروں کی توقعات پر پورا اُترنے کی کوشش کریں اور ہم دوسروں سے توقعات کم سے کم کردیں۔ اللہ تعالیٰ ہماری اصلاح فرمائے اور اللہ ہمیں خوش اور پُر سکون رہنے کا گُر سکھادے اور وہ گُر یہ ہے کہ دوسروں سے توقعات نہ رکھی جائیں۔

---

(۱) سنن ابن ماجہ، کتاب الزکاۃ، باب کراھیۃ المسألۃ

تصورات

((اَللّٰھُمَّ اِنِّی اَعُوْذُ بِکَ مِنْ مُنْکَرَاتِ الْاَخْلَاقِ وَالْاَعْمَالِ وَالْاَھْوَاءِ وَالْاَدْوَاءِ))[1]

''اے اللہ! بے شک میں بُرے اخلاق، بُرے اعمال، بُری خواہشوں اور بُری بیماریوں سے تیری پناہ مانگتا ہوں۔''

ہم توقعات پر بات کر چکے ہیں کہ اللہ سے جو توقعات لگائی جاتی ہیں ان کو ''توکّل'' کہتے ہیں۔ اللہ پر توکّل کرنے کا اور اُس سے توقعات وابستہ کرنے کا کیا فائدہ ہوتا ہے؟ انسانوں سے توقعات رکھنے کے کیا فائدے اور نقصانات ہیں؟ ان پہلوؤں پر بات ہو چکی۔ توقع دراصل ہے کیا؟ انسان کا ایک خیال، ایک سوچ یا پھر ذہن کا ایک ''تصور''۔ قرآن حکیم میں لفظ ''تصور'' تو استعمال نہیں ہوا لیکن اس کے قریب تر معنی کا لفظ ''ظن'' قرآن میں کئی جگہ استعمال ہوا ہے۔ یعنی سوچنا (conjecture) اور تصور (imagine) کرنا۔ بالفاظِ دیگر کسی شے کو سوچنا ''تصور'' اور اس کے بارے میں کچھ خیالات رکھنا ''تصورات'' کہلاتا ہے۔

ایسی چیزوں کے بارے میں سوچنا جس میں دین اور دنیا کی بہتری ہو۔ یہ تصور انسان کو فائدہ دیتا ہے، اس کا عمل بہتر بناتا ہے اور اس کی شخصیت بھی نکھرتی چلی جاتی ہے۔ مثال کے طور پر ہم نے ''تذلل'' پر بات کی تھی کہ اگر کوئی شخص تذلل کا شکار ہے اور اپنے اندر سے اس احساسِ کمتری کو دور کرنا چاہتا ہے تو اپنے اُس عیب پر توجہ دے جو احساسِ کمتری کا سبب بن رہا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ اس کے اندر کوئی ایسی خرابی یا کمی ہو جس کی وجہ سے وہ تذلل کا شکار ہے۔ مثال کے طور پر کوئی شخص کسی گناہ سے نہیں بچ پا رہا۔ اب سب سے پہلے تو وہ یہ تصور کرے کہ میں نے اس گناہ کو ترک کر دیا ہے، اللہ کے فضل سے مجھے نجات مل گئی ہے۔ اور دوسری طرف اُس گناہ سے بچنے کی پوری کوشش کرے۔ تو جب یہ عیب نکل جائے گا تو تذلل بھی دُور ہو جائے گا۔ کسی بھی ارادے کی یا کسی بھی اچھے عمل کی ابتدا تصور سے کی جاسکتی ہے۔ اچھا ارادہ بھی تصور ہی ہے، ایک خیال ہے جو دماغ میں آیا۔ اس طرح تصور کی مدد سے تذلل دور ہو جائے گا۔ پھر اگر کسی شخص کا غصہ تیز ہے اور وہ اپنے غصے کی وجہ سے پریشان ہے، اس پر قابو پانا چاہتا ہے۔ غصہ اس کی شخصیت کو بدنما کر رہا ہے، عیب دار کر رہا ہے تو کیا

---

(۱) جامع الترمذی، کِتَاب الدَّعَوَاتِ، بَاب دُعَاءِ أُمِّ سَلَمَةَ

کرے؟ تصور کرے کہ مجھے غصہ نہیں آتا، تصور میں لے کر آئے کہ میں ٹھنڈے مزاج کا ہوں اور ان حالات (situations) کا تجزیہ کرے جن میں اُسے غصہ آتا ہے۔ اور پھر تصور میں لائے کہ کوئی مجھے غصّہ دلا رہا ہے، اور میں کس کس طرح اپنے غصے کو ضبط (control) کر رہا ہوں۔ اپنے تصور میں یہ مشق (practice) کرے کہ مجھے غصہ دلایا جا رہا ہے مگر میں خاموش ہوں، کوئی ردِعمل نہیں دکھا رہا۔ میں نے کچھ عملی اقدامات کر لیے مثلاً پانی پیا، کھڑا ہوا تھا تو بیٹھ گیا، بیٹھا ہوا تھا تو لیٹ گیا، استغفار پڑھنے لگا، وضو کرنے چلا گیا۔ یہ سب سوچیں ذہنی مشق (rehearsal) ہیں۔ یوں سمجھیں کہ تصور یا ظن خود کار تجویز (auto suggestion) کا کام کرتا ہے۔ اپنے آپ کو ہم خود تجویز (suggest) کر رہے ہوتے ہیں کہ اس طرح کے حالات میں ہمیں اس قسم کے رویّے کا اظہار کرنا چاہیے۔ تو جب ہم اس طرح اپنے تصور میں اپنی کمزوریوں سے لڑتے رہیں گے تو ان شاء اللہ حقیقی زندگی میں بھی سرخرو ہو جائیں گے۔ اسی طرح اگر کسی کی آواز بہت اونچی ہے، بہت چیخ کر بولنے کی عادت ہے تو تصور کریں کہ آپ دھیمی آواز میں بات کر رہے ہیں۔ اپنے عزیز و اقارب سے، اپنے دوست احباب سے مناسب آواز میں محوِ گفتگو ہیں۔ لہٰذا جب حقیقی صورتِ حال (real life situation) پیش آئے گی تو اپنی کمزوریوں اور عیوب پر قابو پانا بہت آسان ہو جائے گا۔ ایک اور مثال دیکھیں کہ کچھ لوگ بیٹھے آپس میں کسی کی غیبت کر رہے ہیں اور آپ کو یہ غیبت بہت بُری لگ رہی ہے۔ کیوں کہ اللہ نے اس سے منع کیا ہے۔ اب تصوّر کریں کہ میں گفتگو کا رُخ کس کس طرح بدل سکتا ہوں کہ لوگوں کی توجہ غیبت سے ہٹ جائے۔ تاکہ جب ایسی کوئی صورت حال سامنے آئے تو آپ ذہنی طور پر اس کا تدارک کرنے کے لیے تیار ہوں، اس کو سنبھالنے کی تیاری آپ پہلے سے کر چکے ہوں۔

یہ جو کامیاب بزنس مین ہوتے ہیں ان کے بارے میں سروے (survey) کیا گیا کہ جب انھیں کسی اہم اجلاس میں جانا ہوتا ہے تو یہ پہلے اپنی تیاری (home work) کے طور پر پوری میٹنگ کو ذہن میں لے آتے ہیں، اس کا ایک خاکہ تصور میں بنا لیتے ہیں، کون کون میز پر بیٹھا ہوگا، کس ترتیب (order) سے بیٹھے ہوں گے، کہاں کیا چیز پڑی ہوگی، میرے دائیں بائیں کون ہوں گے۔ پھر یہ پوری مشق کرتے ہیں کہ کیا کیا کہنا ہے، کیا کیا زیرِ بحث (discuss) لانا ہے، کیا باز پرس (inquiries) کرنی ہے، اس پورے منظر نامے کو تصور میں لے آتے ہیں۔ تو جب یہ لوگ اس طرح ذہنی طور پر اپنے آپ کو تیار کر کے وہاں جاتے ہیں تو یقیناً تمام معاملات قابو (control) میں رہتے ہوں گے، ایسے موقعوں پر یہ لوگ دوسرے لوگوں کے متوقع رویّے کو بھانپ لیتے ہیں اور کسی بھی طرح کی صورتحال سے نپٹنے کے لیے تیار ہوتے ہیں، یہ سب تیاریاں پہلے سے کر کے رکھتے ہیں۔ جو

کامیاب کمانڈر رہوتے ہیں وہ پہلے سے منصوبہ بندی کر کے جنگ میں جاتے ہیں، اور تین چار قسم کے لائحہ عمل (strategies) پہلے سے تیار کر کے میدان میں اترتے ہیں۔ دشمن کی چالوں کا پہلے سے ہی حل نکال کر بوقت ضرورت اطلاق کرتے ہیں اور دشمن کو پسپا کر دیتے ہیں۔

اللہ نے صرف انسانوں کے اندر قوتِ تصوّر رکھی ہے، یہ حیوانوں میں نہیں ہوتی۔ اس طریقے سے مختلف حالات میں مختلف قسم کی ہنگامی صورتِ حال سے نمٹنا مشکل نہیں ہوتا۔ انسانی فطرت میں تصوّر کی صلاحیت اللہ نے رکھی ہے اور قرآن کے تمام احکامات بھی انسانی فطرت کے مطابق ہیں۔ قرآن اپنے قاری کی قوتِ تخیل (Power of imagination) کو، قوتِ تصوّر کو بہت اُبھارتا ہے۔ لفظوں میں تصاویر کھینچی جاتی ہیں تاکہ ہمارا تصور متحرک (activate) ہو جائے، ہمارا تصوّر زرخیز ہو جائے۔ قرآن میں کئی بار آتا ہے {وَلَوْ تَرٰی} ''کاش تم دیکھو۔'' {وَمَآ اَدْرٰكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ} ''تم نے کیا سوچا وہ بدلے کا دن کیا ہے۔'' {ثُمَّ مَآ اَدْرٰكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ} (الانفطار: ۱۷، ۱۸) پھر تم نے کیا سوچا وہ بدلے کا دن کیا ہے۔'' پھر قرآن کی مختلف سورتوں میں آخرت کا نقشہ کھینچا گیا ہے مثلاً ''جب سورج لپیٹ دیا جائے گا، سوچیں ذرا وہ کیا منظر ہوگا؟'' آسمان کی طرف دیکھ کر تصور کریں کہ یہ وسیع و عریض آسمان کیسے پھٹے گا۔ سورج کیسے لپیٹا جائے گا، سورج جو اتنی قوت اور توانائی اور حرارت دے رہا ہے، وہ کیسے لپیٹ دیا جائے گا۔ ان باتوں سے تذکیر حاصل کرنے کا ہمارے تصورات سے گہرا تعلق ہے۔

تصورات کا اثر عمل پر پڑتا ہے اور جب انسان قیامت کی تیاری کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو یہ تصورات مددگار ثابت ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جنت اور جہنم کا کیا نقشہ کھینچا ہے، ہماری تصور کی آنکھ کو روشن کیا گیا، اُجاگر کیا گیا، اور ہمیں سوچنے پر مجبور کیا گیا کہ یہ ہے جنت جو تمہارے لیے تیار کی گئی ہے۔ سو تیاری کرو، تاکہ اپنا ٹھکانہ اس پُرسکون، پُرامن، خوبصورت، دلکش، دل نشین مقام پر بنالو۔ اگر کوشش کرو تو اس کو اپنا لو گے، یہ تمہارے نام ہو جائے گا۔ سورۃ رحمٰن میں کیا خوب صورت نقشہ ہے۔

{وَلِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتٰنِ ۝ فَبِاَيِّ اٰلَآءِ رَبِّكُمَا تُكَذِّبٰنِ ۝ ذَوَاتَآ اَفْنَانٍ ۝}

(الرحمٰن: ۴۶-۴۸)

''اور جو شخص اپنے پروردگار کے سامنے کھڑے ہونے سے ڈرا اس کے لیے دو باغ ہیں۔ تو تم اپنے پروردگار کی کون کون سی نعمت کو جھٹلاؤ گے؟ ان دونوں میں بہت سی شاخیں (یعنی قسم قسم کے میووں کے درخت) ہیں۔''

یعنی دو باغ ہیں گھنیرے، سبز اور سایہ دار۔ ان آیات سے انسان کے ذہن میں ایک سکون (tranquility) کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ کون نہیں چاہے گا ایسی جگہ بسیرا کرنے کا! ہر طرف پھل، پھول، نہریں، آبشاریں، گھنے گھنے سایہ دار درخت، ہر طرف سبزہ ہی سبزہ، سکون، آرام، کوئی فکر، کوئی پریشانی نہیں، کھانا پینا بافراغت ہے۔ یہ سب تصور کر کے ایک سکون کا احساس ہوتا ہے۔ اور دیکھیں کہ تصور کیسے انسان کو پُرسکون کرتا ہے۔ اور ایسے ہی تصور کی طاقت انسان کو پریشان بھی کرتی ہے جب جہنم کا نقشہ پیش ہوتا ہے۔ لوہے کے ہتھوڑے برسائے جائیں گے، کھولتا پانی ان کے اوپر انڈیلا جائے گا، ان کی کھالیں جب پک کر اتر جائیں گی تو دوبارہ کھالیں اُگ آئیں گی تاکہ بار بار جلنے کا مزہ چکھیں۔ پینے کو خوفناک چیزیں دی جائیں گی، زقوم کھانے کو ملے گا۔ تصورِ عذاب ہی سے جھرجھری آتی ہے، ڈر لگتا ہے۔ انسان کی سوچ اور انسان کے تصورات انسان کی صحت پر بھی اثر انداز ہوتے ہیں، اچھی چیزیں سوچنے سے خوشی محسوس ہوتی ہے اور تکلیف دہ چیزیں سوچنے سے انسان افسردہ اور بیمار ہو جاتا ہے۔ محض تصور ہی سے یہ اثرات مرتب ہوتے ہیں تو یہ کوئی معمولی چیز نہیں ہے۔ جسمانی اور ذہنی صحت کا بڑا گہرا تعلق ہمارے تصورات سے ہے۔ تصور میں یہ سب لائیں گے تو تیاری بھی کریں گے اور اگر تصور میں نہیں لائیں گے تو تیاری بھی نہیں کریں گے۔

تو یہ تصور بہت اچھی چیز ہے قرآن میں اس کے لیے ''ظن'' کا لفظ آیا ہے۔ پھر ''تذکر اور تفکر'' بھی دراصل تصورات ہی کی شکلیں ہیں۔ یہ سب تصورات کے اچھے استعمالات ہیں۔ دنیا میں جتنی بھی ایجادات ہوئیں ہیں ان کی ابتدا کہاں سے ہوئی؟ تصور ہی سے تو ہوئی! پہلے ذہن میں ایک خاکہ یا نقشہ بنتا ہے کہ یہ چیز یوں ہو سکتی ہے، پھر قدم بڑھاتے بڑھاتے، تصور کرتے کرتے، ایک نئی چیز وجود میں آجاتی ہے۔

تصور کا استعمال غلط ہو تو وہ نقصان دہ ہو جاتا ہے۔ مثال کے طور پر سورۃ الکھف میں مضمون آتا ہے:

{وَّمَآ اَظُنُّ السَّاعَةَ قَآئِمَةً وَّلَئِنْ رُّدِدْتُّ اِلٰى رَبِّيْ لَاَجِدَنَّ خَيْرًا مِّنْهَا مُنْقَلَبًا}

(الکھف: ۳۶)

''میں تو تصور نہیں کر سکتا کہ قیامت آئے گی اور اگر میں اپنے پروردگار کی طرف لوٹا یا بھی جاؤں تو ضرور اس سے اچھی جگہ پاؤں گا۔''

جن چیزوں کے بارے میں یقینی خبر آچکی، ان پر یقین نہ کرنا اور اس کے برعکس یا مختلف تصور قائم کر لینا انسان کو شک میں مبتلا کر دیتا ہے۔ حقیقت کے برخلاف اگر کسی نے اپنی مرضی سے تصور قائم کر لیا تو یہ کیا ہوا؟ خود ہی سوچ لیا، کوئی ذہن میں خاکہ (image) بنا لیا جو حقیقت سے بالکل

مختلف ہے۔ تو ان دو چیزوں کا جب ٹکراؤ (clash) ہوتا ہے تو اس کے نتیجے میں شک (Doubt) جنم لیتا ہے۔ سورۂ جاثیہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

{وَاِذَا قِيْلَ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ وَّالسَّاعَةُ لَا رَيْبَ فِيْهَا قُلْتُمْ مَّا نَدْرِيْ مَا السَّاعَةُ ۙ اِنْ نَّظُنُّ اِلَّا ظَنًّا وَّمَا نَحْنُ بِمُسْتَيْقِنِيْنَ} (۳۲)

''اور جب کہا جاتا ہے کہ اللہ کا وعدہ بے شک حق ہے، (سچا ہے، حقیقت ہے) اور قیامت اس کے آنے میں تو کوئی شک نہیں'' تم نے کہا ''ہم نہیں تصور کر سکتے کہ یہ قیامت کیا ہوتی ہے، گمان سا ہوتا ہے اور ہم یقین کرنے والے نہیں ہیں۔''

غور کریں کہ ان کو حق پر کیوں یقین نہ آیا؟ شک کی وجہ سے! تو انسان کو چاہیے کہ اپنے تصوّر کو قرآن کے تابع رکھے۔ اگر قرآن سے ہٹ کر کوئی تصور قائم کریں گے تو شک کا مرض جنم لے گا۔ غلط تصوّر کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ بغیر ثبوت (proof) کے دوسروں کے بارے میں کوئی تصور قائم کر لیا جائے۔ خود ہی سوچ لیا، خود ہی تصور گھڑ لیا، خود ہی اندازہ لگا لیا تو یہ ظن اور گمان نقصان دہ ہوتا ہے۔ سورۃ الحجرات میں اللہ نے فرمایا:

{يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ} (۱۲)

''اے لوگو جو ایمان لائے ہو! بہت گمان کرنے سے بچو۔ بے شک بعض گمان گناہ ہوتے ہیں۔''

اس آیت میں کون سے گمان کی طرف اشارہ کیا گیا ہے؟ یعنی لوگوں کے بارے میں سوچنا کہ وہ ایسا ہے، ویسا ہے۔ آگے فرمایا بعض گمان گناہ بن جاتے ہیں۔ یعنی ہر تصور کو منع نہیں کیا، بدگمانی کو منع کیا گیا ہے۔ بدگمانی بھی تصور کی ایک قسم ہے، بغیر جواز کے کسی کے بارے میں تصور کر لینا کہ وہ میرا بُرا چاہتا ہے یا وہ میرا دشمن ہے۔ یہ چیز رویّے میں خرابی اور بگاڑ پیدا کرتی ہے، تعلقات میں کھچاؤ اور بگاڑ آجاتا ہے۔ تو بلا ثبوت تصور کو بھی منع کیا گیا ہے۔

تصور انسان کو متحرک (motivate) بھی کرتا ہے۔ کوئی شخص مشکلات میں گھرا ہے یا کسی پریشانی کا شکار ہے اور وہ تصور کرے کہ ان مشکلات کا نتیجہ اچھا نکلے گا تو پھر وہ مشکلات ہلکی لگنے لگتی ہیں۔ لہٰذا اچھا گمان رکھیں، اچھا تصوّر کریں ورنہ اگر بُری بُری باتیں سوچتے رہیں گے تو خرابی ہی خرابی ہے۔ جو محنت کر رہا ہے، جو مشقت کر رہا ہے، جو پریشانی اُٹھا رہا ہے، اسے چاہیے کہ انجام کے بارے میں ضرور سوچے کہ اس کا انجام کتنا اچھا ہوگا۔ اس طرح بندہ مطمئن اور پُرامید رہتا ہے، کام میں لگا رہتا ہے۔ مثال کے طور کوئی بچہ امتحان کی تیاری میں کتنی مشکل اٹھا رہا ہوتا ہے، کھیل کود چھوڑ کر،

دیگر مشغلے ترک کر کے، تیاری (preparation) میں مصروف ہے۔ یہ سب وہ اچھے نتیجے کے لیے برداشت کرتا ہے۔ اب اگر وہ تصور کرے کہ اتنی محنت کے باوجود اگر فیل ہو گیا تو کیا ہوگا؟ اس طرح کا تصور اُس بچے کو پڑھائی سے دور کر دے گا۔

اُمید کیا ہے؟ یہ بھی تصوّر ہی ہے۔ مثلاً جب کسی کی شادی ہوتی ہے تو عموماً ایسے موقع پر اچھی اُمید رکھی جاتی ہے، کہ اب زوجین ایک نئی زندگی شروع کریں گے، اپنا گھر ہوگا، بچے ہوں گے وغیرہ۔ پھر وہ اس کے لیے بھرپور محنت اور کوشش کرتے ہیں۔ اور اگر شادی سے پہلے ہی لڑکی سوچ لے کہ میری شادی کامیاب نہیں ہو سکے گی، مجھ سے میرے سسرال والے خوش نہیں رہیں گے، میرا شوہر مجھ سے محبت نہیں کرے گا، میں اچھی بیوی نہیں بن سکتی۔ تو یہ نا اُمیدی اُس کی شادی کی ناکامی کی باعث بن جائے گی۔ تو بُرا تصور انتہائی حوصلہ شکن (demotivating) ہوتا ہے، یہ خود کو تکلیف پہنچانا ہے، اپنے آپ کو اذیت (torture) دینا ہے۔ اور اچھی اُمید رکھنا، اچھی سوچ رکھنا، اچھے تصورات رکھنا، انسان کو شاداب (fresh) رکھتا ہے اور انسان سعیِ پیہم کرتا رہتا ہے، بڑی بڑی دشوار گھاٹیاں عبور کر لیتا ہے، اِس اُمید پر کہ ان شاء اللہ بہتری ہوگی۔

تخیل:

حقائق پر مبنی چیزوں کے بارے میں سوچنا تصوّر کہلاتا ہے اور غیر حقیقی، غیر معقول چیزوں کے بارے میں سوچنا ''تخیل'' کہلاتا ہے۔ خوابوں خیالوں کی دنیا میں رہنا (flights of fancy)، عمل کا، محنت کا، کوئی ارادہ نہ ہو، نہ اپنے آپ کو متحرک (motivate) کرنے کا ارادہ ہو، صرف خیالوں ہی خیالوں میں زندگی گزار دینا، خیالی پلاؤ پکانا۔ بعض لوگوں کو اس تخیل کی ایسی چاٹ پڑ جاتی ہے کہ وہ فریبِ خیال (hallucination) میں مبتلا رہنا چاہتے ہیں۔ یہ منشیات (drugs) بھی دراصل کیا کام کرتی ہیں؟ انسان کو تخیل کی دنیا میں لے جاتی ہیں، ٹھوس حقائق سے بالکل رشتہ کاٹ دیتی ہیں۔ انسان کسی غیر حقیقی، غیر عقلی دنیا میں، خوابوں خیالوں کی دنیا میں چلا جاتا ہے۔ کسی نے کہا ہے "if wishes were horses, beggars would ride" یعنی اگر تخیلات سے کوئی بہتری ہوتی تو فقیر سب سے آگے ہوتے۔

یہ جو بچوں کی کہانیاں (fairy tales) ہوتی ہیں جن میں پریاں ہوتی ہیں، خوفناک دیو ہوتا ہے، یہ کہانیاں بچوں کو پریوں کے دیس میں لے جاتی ہیں۔ کیا پریوں کے دیس کا کہیں وجود ہے؟ کیا پریاں اصل میں کوئی مخلوق ہیں؟ نہیں! یہ صرف تخیل ہے، کوئی تصور نہیں۔ خوبصورت

شہزادے(charming prince) کا تصوّر، سنڈریلا(cinderella) کا تصوّر، یہ سب تخیل ہے، اور یہ انسان کی شخصیت پر منفی اثر ڈالتا ہے۔ انسان کی قوتِ عمل کو شل اور بے حس کرنے والی چیز ہے۔ جب کہ ''تصوّر'' قوتِ عمل کو بڑھانے والی چیز ہے، عمل میں مددگار ثابت ہوتا ہے۔

تخیل انسانی ذہن کو مفلوج (paralysed) کر دیتا ہے، جیسے کہ شیخ چلی کی کہانیاں۔ جب شیخ چلی بازار میں مرغی کے انڈے بیچنے جا رہا تھا اور ایک منصوبہ (plan) بنا رہا تھا کہ میں انڈے بیچ کر یہ خریدوں گا، پھر وہ خریدوں گا، یونہی کاروبار کرتے کرتے نواب اور امیر کبیر بن جاؤں گا لیکن چلتے چلتے ایک ٹھوکر لگی اور سارے انڈے گر کر ٹوٹ گئے اور سارے منصوبے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ انہی کہانیوں نے بچوں کو اس خیالی دنیا کا باسی بنا دیا ہے۔ اب لڑکیوں کے دماغ میں اپنے ہونے والے شوہر کی تصویر بھی ویسی ہی ہے، یعنی خوبصورت اور پُروجاہت، (tall and handsome) جس کا کہ حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے آج کل لڑکیوں کے لیے شوہر کا معیار صرف ظاہری شکل وصورت اور مال و دولت رہ گیا ہے۔ متقی، نمازی یا شریف النفس انسان نہیں چاہیے۔ لڑکوں کو بھی فلموں اور کہانیوں والی شہزادیاں چاہیے۔ لمبی، دبلی، گوری اور سانچوں میں ڈھلی ہوئی باربی (barbie) چاہیے۔ اس تخیل کو اتنا زیادہ اُبھارا گیا ہے کہ لوگوں کا معیار ہی اس قسم کی لڑکیاں بن کر رہ گئی ہیں کہ لڑکی ہو تو ایسی ہو۔

اسلام ہمیں تخیلات سے نکال کر تصورات میں لے کر آتا ہے۔ حقیقی چیزوں کے بارے میں سوچو، خوابوں کی دنیا میں مت رہو۔ گناہوں کے خیال سے لذّت لینا بھی گناہ ہے، گناہ کر نہیں سکتے تو گناہ کے بارے میں سوچتے رہتے ہیں، مثلاً کسی نامحرم کا خیال ہمہ وقت دل میں پالنا، اس کے بارے میں سوچنا۔ زیادہ تر شاعری تخیل ہی تو ہے۔ سورۃ الشعراء آیت ۲۲۵ اور ۲۲۶ میں اس کا نقشہ کھینچا گیا ہے:

{اَلَمْ تَرَ اَنَّهُمْ فِیْ كُلِّ وَادٍ یَّهِیْمُوْنَ وَاَنَّهُمْ یَقُوْلُوْنَ مَا لَا یَفْعَلُوْنَ}

''کیا تم نے نہیں دیکھا کہ وہ ہر وادی میں سرمارے پھرتے ہیں اور کہتے وہ ہیں جو کرتے نہیں۔''

شاعر ہر وادی میں دیوانہ وار پھرتے ہیں، کبھی آسمانوں کی بات کریں گے تو کبھی زمین کی۔ ہر مصرعے میں مختلف داستان بیان ہوتی ہے، مختلف حالات کا ذکر ہوتا ہے، ایک انتہا (extreme) سے نکلیں گے تو دوسری انتہا (extreme) میں جا پہنچیں گے۔ اور جو کہتے ہیں وہ کرتے نہیں۔ تو تخیل انسان کا کردار کمزور کر دیتا ہے لہٰذا اس سے بچنے کی ضرورت ہے۔ تخیل کی انتہائی شکل یہ ہوتی

ہے کہ باقاعدہ کچھ لوگ نظر آنے لگتے ہیں، یہ تو خیر بیماری (schizophrenia) ہے، بندہ مجبور ہوتا ہے اس کا اپنا کوئی ہاتھ نہیں ہوتا لیکن یہ بھی تخیل ہی کا بگاڑ ہوتا ہے۔ خلاصہ یہ کہ دو چیزیں ہیں ''تصورات'' جو مثبت (positive) قوت ہے اور تخیلات جو کہ منفی (negative) چیز ہے۔

اللہ تعالیٰ نے ہمیں تصوّرات پر توجہ (focus) رکھنے کو کہا ہے۔ جنت کا تصوّر کرو، جہنم کا تصوّر کرو، قیامت کا تصور کرو۔ حشر کا میدان ذہن میں لاؤ۔ اپنے آپ کو بہتر بنانا چاہتے ہو تو پہلے اپنے آپ کو بہتر تصوّر کرو۔ تم مثبت سوچیں سوچو۔ اگر منفی سوچو گے، خراب تصورات ذہن میں لاؤ گے تو افسردہ (depress) ہو کر بے عمل ہو جاؤ گے۔ فطرت میں اللہ تعالیٰ نے تصوّر کی قوت اس لیے رکھی ہے کہ ہم ظاہر کو ہی سب کچھ نہ سمجھ بیٹھیں بلکہ اشیاء کی حقیقت تک پہنچ سکیں۔ اپنے تصور کا استعمال کر کے چیزوں کی حقیقت دیکھ لیں، اَن دیکھی چیزوں کو مان لیں، ہمارا ایمان تو ایمان بالغیب ہی ہے۔ حقیقت تو غیب کے پردے میں ہے، وہ تو اس دنیا سے تعلق ٹوٹنے کے بعد ظاہر ہوگی۔ ہم غیبی دنیا کا تجربہ اپنی آنکھوں سے تو نہیں کرتے، نہ سونگھتے ہیں، نہ چکھتے ہیں، نہ کسی اور طرح محسوس کرتے ہیں، تو اگر ہمارے پاس قوتِ تصور نہ ہوتی تو ہم غیب پر کبھی ایمان نہ لا پاتے۔ تو تصور بہت مبارک چیز ہے۔

اَمانیّ:

قرآن حکیم میں غلط تخیلات کے لیے ''اَمانی'' کا لفظ آتا ہے۔ شیطان کہتا ہے میں لازماً انھیں جھوٹی آرزوئیں دلاؤں گا۔ جھوٹی آرزو تخیل ہی ہے۔ جھوٹی آرزو ہی نے تخیل کے ذریعے شرک کا چرچا دنیا میں کر دیا۔ انسانوں نے اپنے تخیل میں دیوی دیوتا گھڑ لیے۔ تو یہ انسان کو عقیدے کی خرابی کی طرف لے کر گیا اور عمل میں بھی خرابی کا باعث بنا۔

''توہمات'' (superstitions) دراصل تخیل کی ایک شاخ ہے جس کو ہم وہم ہو جانا کہتے ہیں۔ مثلاً اگر شیشہ ٹوٹ جائے تو سہاگ پر آنچ آنے والی ہے، ازدواجی زندگی پر اس کا بُرا اثر پڑتا ہے، یا کالی بلی راستہ کاٹ گئی تو پریشانی آنے والی ہے اور اگر سیڑھی کے نیچے سے گزر گئے تو بُرا شگون ہے۔ یہ سب ''توہمات'' ہیں اور یہ تخیل ہی کی پیداوار ہیں۔ یہ چیزیں پھر انسان کو بزدل بنا دیتی ہیں، اللہ سے دُور کر دیتی ہیں، عمل کے اندر شرک پیدا ہونے لگتا ہے۔ تخیل کا اور وہم کا علاج یہ ہے کہ شرک پر جو آیات آئی ہیں، اُن پر غور کیا جائے۔ جتنی زیادہ اللہ کی معرفت حاصل ہوگی، جتنی اللہ سے قربت ہوگی، اتنا ہی ''تخیل'' اور ''وہم'' کا علاج ہوتا جائے گا۔ یہاں تک کہ تخیل اور وہم مٹ جائے گا اور اس کی جگہ صحیح چیز کا تصوّر دماغ میں آجائے گا۔ سوچوں سے اور خیالات ہی سے متعلق ایک چال ہے

جو شیطان استعمال کرتا ہے اور وہ ہے ''وسوسہ''، (compulsive thought)۔ سورۃ الناس میں شیطان کا نام ہی ''وسواس'' آیا ہے، جس سے پناہ مانگی گئی ہے۔

{مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ الْخَنَّاسِ} (الناس:۴)

''جو پھسلائے بدی سے اور چھپ جائے۔''

شیطان بار بار آتا ہے، پلٹ پلٹ کر آتا ہے اور انسانوں کے دلوں میں وسوسے ڈالتا ہے۔ حدیثِ پاک میں مضمون آتا ہے کہ شیطان کی تھوتھنی جیسی ناک ہوتی ہے، جس طرح کسی کتے کی یا اسی سے ملتے جلتے کسی اور جانور (dog family) کی ہوتی ہے۔ وہ انسان کے دل پر اپنی ناک رکھتا ہے، سونگھتا ہے، اگر وہ دل اللہ کے ذکر میں مصروف ہوتا ہے تو پیچھے ہٹ جاتا ہے اور اگر اللہ کے ذکر سے غافل پاتا ہے تو دل میں گھس کر بیٹھ جاتا ہے، دل پر قابض (occupy) ہو جاتا ہے۔ اور پھر اس کے بعد کیا ہوتا ہے، شیطان انسان کے جسم میں ایسے گردش کرتا ہے جیسے خون گردش کرتا ہے، جس طرح دل جسم میں خون رواں کرتا ہے۔ اسی طرح شیطان کے وسوسے اور شیطانی خیالات بھی پورے جسم میں گردش کرتے ہیں۔ اور پھر شیطانی اعمال سرزد ہونے لگتے ہیں۔ اس وسوسے سے بھی محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ تزکیے کا ایک اہم ہدف دلوں کو وسوسوں سے بچانا ہے۔ اور اگر وسوسے سے پوری طرح بچانے پر ہم قادر نہ ہوں تو کم از کم اس پر عمل نہ کریں۔ جو فاسد خیال دل میں آیا ہو اس پر عمل نہ کریں۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ''نبی اکرم ﷺ سے وسوسے کے بارے میں پوچھا گیا کہ دل میں کفر اور شرک اور فسق فجور کے جو وسوسے آتے ہیں اُن کا کیا حکم ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا ''یہ وسوسے خالص ایمان کی علامت ہیں۔'' آپ ﷺ کے اس قول سے کتنا اطمینان حاصل ہوتا ہے کہ مومن کے لیے تو گناہ کا خیال وسوسے سے بڑھ کر کوئی حیثیت نہیں رکھتا۔ جب کہ کافر یا منافق کا معاملہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اس خیال پر عمل کر جاتا ہے۔ تو اگر کسی خیال کو وسوسے تک ہی محدود کر دیا، یہ ایمان کی وجہ سے کیا۔ ایک صحابی رضی اللہ عنہ نے آ کر رسول اللہ ﷺ سے یہ بات کہی کہ میرے دل میں ایسے ایسے وسوسے آتے ہیں کہ میں اُن کو زبان پر لانے سے بہتر سمجھتا ہوں کہ میں جلا کر راکھ کر دیا جاؤں۔ تو میں کیا کروں۔'' آپ ﷺ نے فرمایا ''یہ تو ایمان کی علامت ہے۔ ایمان تھا تو تمہیں یہ خیال آیا کہ یہ غلط وسوسہ ہے۔ اگر ایمان نہ ہوتا تو تم کو احساس بھی نہ ہو پاتا کہ یہ غلط خیال ہے۔'' اور دوسری بات یہ کہ چور وہیں پر آتے ہیں جہاں کوئی خزانہ ہو۔ جس دل میں ایمان کی دولت ہے، وہیں شیطان ڈاکہ ڈالنے کی کوشش کرتا ہے، وسوسوں کے ذریعے سے۔ یہ وسوسہ

شیطان کا عمل ہے اور شیطان ایمان کا چور ہے۔ اور وسوسے پر پریشان ہونا ایمان کی علامت ہے، ورنہ اگر کفر ہوتا تو بُرے خیالات پر پریشانی نہ ہوتی۔ حدیث میں آتا ہے کہ اللہ کا شکر ہے کہ اس نے شیطان کے مکر کو وسوسے کی حد تک محدود کر دیا۔ کتنی پیاری بات ہے شیطان کی چال کو وسوسے کی حد تک محدود کر دیا، بس خیال تک محدود رہ گیا۔ ایک اور حدیث میں آتا ہے ''اللہ تعالیٰ نے میری امت کے دلوں میں پیدا ہونے والے وسوسوں سے درگزر فرمایا ہے۔'' گناہ کا وسوسہ دل میں آئے اس پر مواخذہ نہ ہوگا، جب تک اس پر عمل نہ کیا جائے۔ گناہ کے خیال کا فوری توڑ یہ ہے کہ اللہ کی پناہ مانگ لی جائے۔ جیسے کہ یوسف علیہ السلام نے دعا کی تھی:

{وَاِلَّا تَصْرِفْ عَنِّیْ کَیْدَهُنَّ اَصْبُ اِلَیْهِنَّ وَاَکُنْ مِّنَ الْجٰهِلِیْنَ} (۳۳)

''اللہ اگر تو نے مجھے ان عورتوں کی چالوں سے دُور نہ کیا، تو میں ان کی طرف مائل ہو جاؤں گا، اور میں جاہلوں میں سے ہو جاؤں گا۔''

تصوّر، تخیل اور وسوسے میں فرق:

تصوّر، تخیل اور وسوسے میں کیا فرق ہے؟ تصوّر اور تخیل میں انسان کی اپنی کوشش (effort) کا دخل ہوتا ہے۔ اپنے ارادے سے، اپنی کوشش سے وہ کوئی چیز سوچتا ہے۔ جب کہ وسوسہ میں اس کے اپنے ارادے اور کوشش کا کوئی دخل نہیں ہوتا، خود بخود ایک خیال دل میں آجاتا ہے۔ بیٹھے بٹھائے اچانک کہیں سے ایک حملہ ہو جاتا ہے، جیسے ایک دم کوئی کیڑا کاٹ لیتا ہے بغیر اطلاع دیئے، بغیر محسوس ہوئے۔ اسی طرح یہ وسوسہ بے ضابطہ کہیں سے آجاتا ہے اور جب آتا ہے تو اس کی تکلیف محسوس ہوتی ہے۔ لیکن اپنی طرف سے، سوچ کر، گناہ کا تصوّر قائم کرنا یا ارادہ کرنا، یہ شعوری عمل ہے، اس پر گناہ ہوگا۔ وسوسہ کا لفظ ہمیشہ بُرے مفہوم (sense) میں استعمال ہوتا ہے یعنی کسی نجس خیال کو وسوسہ کہتے ہیں۔

بدشگونی بھی دراصل وسوسہ ہی ہے۔ وسوسہ دُور کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو زیادہ اہمیت نہ دی جائے، اس کو دماغ میں جگہ مت دیں، فوراً اعوذ باللہ پڑھ لیں، زیادہ توجہ نہ دیں کیوں کہ وسوسہ توجہ سے پلتا ہے، نشوونما پاتا ہے، توجہ کا محتاج ہوتا ہے، توجہ نہ دی جائے تو محو ہو جاتا ہے، اپنی موت آپ مر جاتا ہے۔ اور اگر توجہ دی جائے تو پھر یہ پختہ (concrete) ہونے لگتا ہے، قدم جمانے لگتا ہے۔ شیطان تو چاہتا ہی یہ ہے کہ ہم وسوسوں پر توجہ دیں۔ اُس پر بات چیت کریں تاکہ وہ پختہ سے پختہ تر ہو جائے اور دوسروں تک بھی فاسد خیالات پہنچ جائیں۔ لہٰذا اس کو بالکل اہمیت نہیں دینی چاہیے۔ کوئی برا خیال آئے تو اللہ کی پناہ طلب کریں۔ جتنا سوچیں گے، دوسروں سے تذکرہ

(discuss) کریں گے، اتنا ہی ذہن میں پختہ ہوتا چلا جائے گا۔

ایک اور علاج یہ ہے کہ اپنے آپ کو کسی اور کام میں مصروف کر لیں اور اگر کسی چیز کے بارے میں وہم آ رہا ہے کہ یوں کرونگی تو یہ ہو جائے گا تو پھر وہ کام ضرور کیجیے تا کہ وہم نکل جائے اور معلوم ہو جائے کہ سب جھوٹ ہے۔ ایک خوبصورت دعا ہے، ''اے اللہ میرے دل میں آنے والے خیالات کو اپنی مشیت اور اپنے ذکر میں تبدیل فرما دے اور اے اللہ! میری فکروں کو، میری پریشانیوں اور خواہشات کو ایسا بنا دے جیسا تجھے پسند ہے اور جن سے تو راضی ہے۔'' یعنی جو عمل میں کروں وہ تجھ کو راضی کرنے والا ہو۔ کیوں کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ انسان کی فکر، پریشانی اور خواہش بندے کو شیطان کے راستے پر لے جائے۔ یہ بہت ہی اچھی اور پیاری دعا ہے، انسان محتاط رہے، اللہ سے لو لگا کر رکھے، اور اللہ کی یاد کو دل میں رکھے تو ان شاء اللہ تعالیٰ شیطان کا حملہ مؤثر نہ ہوگا۔ لیکن حملہ تو وہ ضرور کرے گا۔ کبھی یہ مت سوچیں کہ ہم تو قرآن پڑھنے والے ہیں، ہم پر تو شیطان حملہ کر ہی نہیں سکتا، کسی وسوسے اور اندیشے کا ہم شکار ہو ہی نہیں سکتے۔ اصل بات یہ ہے کہ جو اللہ کے ذکر سے غافل ہے وہ تو شیطان کے لیے تر نوالہ ہے۔ اس کے اوپر تو کوئی خاص محنت کرنی ہی نہیں پڑتی۔ شیطان کی پریشانی کا باعث تو وہ بنتا ہے جو اللہ کے ذکر کے ساتھ اپنے آپ کو جوڑ رہا ہے۔ جو اللہ کو بھولا بیٹھا ہے شیطان کو اس سے کوئی خطرہ نہیں، نہ وہ اس میں دلچسپی (interest) لیتا ہے، یہ تو خود شیطان ہی کا دوست ہے۔ شیطان کو خطرہ مومن سے ہے، جو اللہ کی راہ میں چل پڑے اور اپنا تعلق قرآن سے جوڑے۔ شیطان سب سے شدت سے اُسی پر حملہ آور ہوتا ہے، اُسی کو بہکاتا اور ورغلاتا ہے، اللہ سے دُور کرنے کے لیے اس پر محنت مشقت کرتا ہے، فکروں اور پریشانیوں میں مبتلا کرتا ہے، اس انسان سے ڈرتا ہے، تو وہ اُس کو اندر ہی اندر کمزور کرنا چاہتا ہے، اندیشوں اور وسوسوں کے ذریعے۔ تو اندیشہ اور وسوسہ کو ایمان کی کمزوری ہرگز نہ سمجھیں، بلکہ یہ ایمان کی مضبوطی ہے۔ اپنے آپ کو مصروف کر لیں، اللہ سے اچھی اچھی اُمیدیں لگائیں، اچھی مثبت سوچ رکھیں، اور یہ سوچیں کہ یہ وہم، تو ہمات ہیں یہ اندیشے ہیں، ان سے کچھ نہیں ہوتا اللہ میری تقدیر میرے پیدا ہونے سے پہلے لکھ چکا ہے، مجھے کیا گھبراہٹ۔ اللہ پر توکل ہے، اللہ تو بہتر مولا، بہتر مددگار ہے، میں مومن ہوں مجھے کیا فکر۔ پھر وسوسوں کا، زندگی پر منفی اثر نہیں ہو پاتا۔ اس یقین کا زندگی پر مثبت اثر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق عطا فرمائے کہ ہم اپنے خیالات کا تجزیہ کر سکیں، اِن کا جائزہ لے سکیں، اور اللہ ہمارے خیالات کو پاکیزہ کر دے۔ آمین ثم آمین!

حمیّت

((اَللّٰھُمَّ اٰتِ نَفْسِیْ تَقْوٰھَا وَزَکِّھَا اَنْتَ خَیْرُ مَنْ زَکّٰھَا اَنْتَ وَلِیُّھَا وَمَوْلٰھَا)) (۱)
((اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَعُوْذُبِکَ مِنْ مُنْکَرَاتِ الْاَخْلَاقِ وَالْاَعْمَالِ وَالْاَھْوَآءِ وَالْاَدْوَآءِ)) (۲)
((اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَسْئَلُکَ الْھُدٰی وَالتُّقٰی وَالْعَفَافَ وَالْغِنٰی)) (۳)

(loyalty) کو عام الفاظ میں وفاداری کہا جاتا ہے، اردو زبان میں حمیّت کو غیرت بھی کہا جاتا ہے جو کہ ایک خوبی ہے، اچھا وصف ہے۔ غیرت مند انسان نہ ہونا تو کوئی اچھی بات نہیں۔ انسان کو اپنی ذات کے لیے غیّور ہونا چاہیے، اپنے خاندان کے لیے بھی غیرت ہونی چاہیے کہ کوئی اس کے خاندان والوں کو بُرا بھلا نہ کہے، بلاوجہ ایذا اور تکلیف نہ پہنچائے، ملک اور قوم کے بارے میں بھی غیرت ہونی چاہیے کہ ملک کی بدنامی نہ ہو، ہمارے ملک کو کوئی بُرا بھلا نہ کہے، تو یہ غیرت یا حمیّت بہت پسندیدہ چیز ہے۔

حمیت سب سے پہلے اللہ اور اس کے دین کے لیے:

انسان کو چاہیے کہ اپنی زندگی میں ترجیحات (priorities) متعین کرلے کہ اُس کی زندگی میں اہم ترین چیز کیا ہے جس کے بارے میں حمیّت ہونی چاہیے۔ سب سے اہم چیز ہے ''دین۔'' اللہ تعالیٰ اور اُس کے دین کے لیے انسان میں سب سے زیادہ حمیّت ہونی چاہیے، وفاداری ہونی چاہیے۔ اللہ کے ساتھ لوگوں کی وفاداری اُس کے احکام کی تکمیل کا جذبہ اور اس کے ساتھ محبت دیکھ کر خوشی کا احساس ہونا چاہیے۔

اس کے برعکس اللہ کی نافرمانی ہوتا دیکھ کر اور دین کے احکامات ٹوٹتے دیکھ کر انسان کے اندر شدید غصے اور غضب کے جذبات ابھرنے چاہئیں، اُس کی غیرت یہ دیکھ کر تلملا اُٹھے، دکھ، غم اور غصے کا احساس ہو۔ حدیث میں ایک واقعہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کی نسبت سے نقل ہوا ہے۔

((أَوْحَى اللهُ عَزَّ وَجَلَّ اِلَى جِبْرِيلَ عَلَيْهِ السَّلَامُ أَنِ اقْلِبْ مَدِينَةَ كَذَا وَكَذَا

---

(۱) صحیح مسلم، کِتَاب الذِّکْرِ وَالدُّعَاءِ وَالتَّوْبَةِ وَالاِسْتِغْفَارِ، بَاب التَّعَوُّذِ مِنْ شَرِّ مَا عَمِلَ
(۲) جامع الترمذی، کِتَاب الدَّعَوَاتِ، بَاب دُعَاءِ أُمِّ سَلَمَةَ
(۳) صحیح مسلم، کِتَاب الذِّکْرِ وَالدُّعَاءِ وَالتَّوْبَةِ وَالاِسْتِغْفَارِ، بَاب التَّعَوُّذِ مِنْ شَرِّ مَا عَمِلَ

بِأَهْلِهَا، قَالَ: فَقَالَ: يَا رَبِّ اِنَّ فِيهِمْ عَبْدَكَ فُلَانًا لَمْ يَعْصِكَ طَرْفَةَ عَيْنٍ، قَالَ: فَقَالَ: اقْلِبْهَا عَلَيْهِمْ، فَاِنَّ وَجْهَهُ لَمْ يَتَمَعَّرْ فِيَّ سَاعَةً قَطُّ)) (۱)

''ایک دفعہ حضرت جبرئیل علیہ السلام کو حکم ہوا کہ فلاں بستی کو وہاں کے رہنے والوں سمیت اُلٹ دو۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے عرض کیا کہ ''اے اللہ اس بستی میں تیرا ایک بندہ ایسا بھی ہے جس نے کبھی زندگی میں پلک جھپکنے کی دیر تک (blink of an eye) بھی تیری نافرمانی نہیں کی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اُس پر بھی اُلٹو اور باقی بستی والوں پر بھی۔ کیوں کہ میری اُس بستی میں میری نافرمانیاں ہوتی رہیں اور یہ سب دیکھ کر اس کے چہرے کا رنگ تک کبھی نہ بدلا، (سب کچھ دیکھتا رہا لیکن اس کی تیوری پر بل نہ آیا۔ اس کی غیرت نے یہ سب گوارا کرلیا، اس کو اپنے رب کی نافرمانی دیکھ کر بُرا نہ لگا۔ یہ اپنی ہی نماز روزے میں مشغول رہا۔ اور دوسروں کے سُدھار اور اصلاح کی فکر نہ کی۔ اس کو میرے احکامات علم تھا۔ لیکن یہ میرے احکامات کی پامالی خاموش تماشائی بنا دیکھتا رہا۔ اس وجہ سے یہ تو اُن سب سے بڑا مجرم ہے۔)''

ذاتی عبادات میں انسان مصروف ہو، فرائض ادا کرتا ہو لیکن دینی غیرت اور حمیّت کا فقدان ہو تو ایسی عبادات اللہ کے ہاں قابلِ قبول نہیں ہیں۔ اس حمیّت کے ہی نتیجے میں تو بندہ نہی عن المنکر کرتا ہے، معاشرے میں سدھار اور اصلاح کے لیے ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔ دوسروں کی آخرت کی فکر کرتا ہے۔ یہی تو دینی حمیّت ہے، اس کام میں اس کا کوئی ذاتی مفاد (cause) تو ہے نہیں۔ یہ تو محض اللہ کی خاطر اور اُس کی رضا کے لیے، دین کی حفاظت کے لیے دوڑ دھوپ ہے۔ اگر اذان ہوتی ہے اور کوئی نماز نہیں پڑھ رہا تو یہ آپ کا ذاتی معاملہ تو نہیں، آپ کا کیا بگڑتا ہے؟ پھر ہم کیوں دکھ اور تکلیف محسوس کرتے ہیں اور باقی لوگوں کو کہتے ہیں اُٹھو نماز ادا کرو۔ صرف دین کی حمیّت کی وجہ سے! ہمیں دین کی بے وقعتی اپنی بے عزتی محسوس ہوتی ہے کہ یہ بندہ کیوں اللہ کی بات نہیں مانتا، اللہ کے حکم کو اتنا ہلکا کیوں سمجھ رہا ہے اُس کی نافرمانی ہمیں تکلیف دیتی ہے یہ دینی غیرت کا تقاضا ہے۔

جیسے اگر کسی مجلس محفل میں کوئی کسی کے والدین کا مذاق اڑائے تو وہ یہ برداشت نہیں کر سکے گا۔ اگر بدلہ نہ بھی لے تو وہاں سے اُٹھ ضرور جائے گا، اپنی ناراضگی کا، غم وغصہ کا اظہار ضرور کرے

(۱) شعب الایمان للبیھقی، احادیث فی وجوب الامر والنھی عن المنکر علی من قدر علیھما بما قدر علیہ

گا۔ یہ حمیّت کی وجہ سے ہوتا ہے کیوں کہ ہماری اپنوں سے وفاداریاں ہیں۔ ہماری غیرت یہ گوارا نہیں کرسکتی کہ ہمارے والدین یا خاندان والوں کو کوئی بُرا بھلا کہے یا مذاق اڑائے۔ اس طرح دینی حمیّت کا تقاضا ہے کہ جہاں دین کا مذاق اڑایا جارہا ہو وہاں انسان نہ بیٹھے۔

سورۃ الانعام اور سورۃ المائدہ میں اللہ تعالیٰ نے یہ مضمون بیان فرمایا ہے کہ:

{اِذَا سَمِعْتُمْ آيَاتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَأُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوا مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهٖ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ} (النساء: ۱۴۰)

''مت بیٹھو اُن لوگوں کے ساتھ جو دین کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اگر تم نے یہ کام کیا تو تم بھی انہی میں سے ہوجاؤ گے۔''

حمیّت کا تعلق اولین اللہ کے ساتھ ہونا چاہیے اور پھر باقی معاملات میں درجہ بدرجہ اپنے مقام مرتبے کے لحاظ سے انسان میں حمیّت اور غیرت ہو۔

اگر حمیّت اللہ کے لیے نہیں ہے یا پھر اللہ کے لیے کم ہے، خاندان یا قبیلے کے لیے زیادہ ہے، ان سے وفاداری (loyalty) ان کی عزت کا احساس زیادہ ہے، بہ نسبت اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی عزت کے تو ایسی حمیّت کو حمیّتِ جاہلیہ کہا جائے گا۔ سورۃ الفتح میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے۔

{اِذْ جَعَلَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ قُلُوْبِهِمُ الْحَمِيَّةَ حَمِيَّةَ الْجَاهِلِيَّةِ} (الفتح: ۲۶)

''اور جب بنا دی اپنے دلوں میں ان لوگوں نے جنہوں نے کفر کیا جاہلیت کی حمیّت۔''

تو یہ جاہلی حمیّت یعنی خاندان، کنبے، قبیلے، رشتہ داروں کے ساتھ اندھی وفاداری، اُن کے بارے میں زیادہ احساس اور غیرت کا اظہار کرنا اور اللہ کے بارے میں بے نیاز ہوجانا، یہ چیز اللہ کو بالکل پسند نہیں ہے۔

اللہ کے سوا کسی سے غیر مشروط وفاداری (unconditional loyalty) رکھنے کا منطقی نتیجہ یہ نکلے گا کہ اُن کی ہر بات ٹھیک لگے گی۔ کچھ بھی کریں، غلط کریں، صحیح کریں، الٹا کریں، سیدھا کریں، سیاہ کو سفید کہیں، دن کو رات کہیں، ہر چیز نبھائیں گے اور اُن کی ہاں میں ہاں ملاتے رہیں گے۔ اس لیے کہ اس سے وفاداری ہے یا یہ کہ میرا خاندان ہے اور یہ میری حمیّت کا تقاضا ہے۔ اور دین کی صحیح بات کو نہیں مانیں گے کہ میرے خاندان والے نہیں مانتے۔ مشرکین مکہ سے جب کہا جاتا

تھا ''آ جاؤ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی طرف'' تو ان کا جواب ہوتا، ''کافی ہے ہمارے لیے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا۔'' یعنی وہ اپنی وفاداری کا مرکز اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کو نہیں بناتے۔ یہ ہے حمیّتِ جاہلیہ، یہ پسندیدہ نہیں۔ تو جب ہم اسلام کے نور میں آ گئے ہیں تو ہمیں یہ بالکل زیب نہیں دیتا کہ کوئی بھی رسم، کوئی بھی طریقہ، کوئی بھی سوچ جو دورِ جاہلی کی پیداوار ہو، اُس کو اپنی زندگی میں شامل کریں۔ جب پہچان ہوگئی ہے تو نجات حاصل کرنے کا ارادہ کر لینا چاہیے۔

''حیا'' (:Modesty)

حیا کے بارے میں امام غزالی رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے کہ'' حیا فطرت کی محافظ ہے۔'' (Guardian of our nature) شریعت انسان کی عادتوں کو فطرت سے قریب کرنا چاہتی ہے اور شیطان چاہتا ہے کہ ہماری عادتوں کو جبلّت سے قریب کر دے۔

حیا انسان کا خاصّہ :

حیا اُن انسانوں میں ہوتی ہے جو جبلّت سے بلند زندگی گزار رہے ہوتے ہیں۔ چونکہ جانور صرف جبلّت کی سطح پر زندگی گزارتے ہیں اس لیے جانوروں کے اندر حیا نہیں ہوتی۔ شیطان کا تو کام ہی یہ ہے کہ وہ کسی طرح ہمیں جانوروں کی سطح پر لے آئے۔ فطرت کے تقاضوں سے غافل کر دے۔ کسی طرح بہکائے اور واردات کرے۔ تو اللہ نے ہمیں محتاط رہنے کی تاکید کی ہے، فرمایا:

{يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ وَمَنْ يَتَّبِعْ خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ فَإِنَّهُ يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ} (النور: ۲۱)

''اے لوگوں جو ایمان لائے ہو شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی مت کرنا جو بھی شیطان کے نقشِ قدم کی پیروی کرے گا تو شیطان تو حکم دیتا ہے فحش کام اور بُرائی کا۔''

شیطان کا طریقہ واردات دو چیزوں میں مضمر ہے، فحاشی اور منکرات۔ ان دو ہتھیاروں سے وہ انسانوں پر حملہ کرتا ہے اسی لیے اللہ نے ان دو حربوں سے ہمیں پہلے ہی خبردار کیا ہے۔ سورۃ النحل میں آتا ہے:

{وَيَنْهَى عَنِ الْفَحْشَاءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ} (النحل: ۹۰)

''اللہ تعالیٰ روکتا ہے (منع کرتا ہے) فحش سے اور منکر سے اور زیادتی کرنے سے۔''

حیا انسان کی فطرت میں ہے:

حیا انسان کی فطرت میں موجود ہے۔ یہ کوئی سکھانے والی چیز نہیں ہے بلکہ انسان یہ سیکھا سکھایا

پیدا ہوتا ہے۔ اگر ہم پہلے انسان یعنی حضرت آدم علیہ السلام کو دیکھیں تو حیا کا تصور ہمیں اُن کی حیات مبارکہ میں بھی ملتا ہے۔ جب شیطان کے بہکانے میں آ کر حضرت آدم علیہ السلام اور بی بی حوا علیہا السلام نے وہ جنت کا پھل کھایا جس سے اللہ نے منع کیا تھا تو ان کے ستر کھل گئے اور انہوں نے فوراً اپنے آپ کو پتوں سے ڈھانپنے کی کوشش کی۔ کیوں کہ ایک فطری جذبہ اُن کے اندر موجود تھا کہ یہ عریانیت (nakedness) اچھی شے نہیں ہے۔ غور کریں تو وہاں کوئی بھی نہیں تھا، صرف اکیلے میاں بیوی تھے لیکن اُنہوں نے پھر بھی فوراً اپنے آپ کو ڈھانپنا شروع کر دیا۔

منکرات میں مبتلا ہونا:

شیطان کا طریقہ واردات یہ ہے کہ وہ انسان کو براہِ راست فحش کاموں کا حکم نہیں دیتا۔ بلکہ وہ درجہ بدرجہ انسان کو فحش کاموں میں لگاتا ہے، پہلے منکرات کی طرف راغب کرتا ہے۔ منکر کا مطلب ہے بُرائی۔ اس میں وہ چیزیں بھی شامل ہیں جن کے بُرے ہونے پر فطرت دلالت کرتی ہے، اُس کو پہچانتی ہے، جیسے جھوٹ، چوری وغیرہ۔ اور منکر کے اندر وہ بُرائیاں بھی شامل ہیں جن کا بُرا ہونا انسان خود سے نہیں جان سکتا۔ ایسی چیزوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے بتا دیا ہے مثلاً سود، سور کا گوشت، رشوت وغیرہ۔ ''منکر'' دراصل وہ سب کام ہیں جو انسان کی فطرت (human nature) کو مسخ (distort) کر دیتے ہیں جب کہ شریعت کا مقصد انسان کی فطرت کی حفاظت اور اُس کو خالص رکھنا ہے۔ اس لیے شریعت میں سود اور رشوت جیسی آمدن کے ذرائع پر پابندی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حرام کردہ ذرائع سے رزق حاصل کرنا ''منکر'' ہے اور یہ منکر انسان کو فحش کی طرف لے جاتا ہے۔ جتنا انسان حرام اور ناجائز کمائی میں ملوث ہوگا اُتنے ہی بے حیائی والے اعمال بڑھتے چلے جائیں گے اور اندر سے حیا ختم ہوتی چلی جائے گی۔ قرآن نے ہمیں یہ سبق سکھا دیا کہ حیا چاہتے ہو تو سب سے پہلے حلال کماؤ اور حلال کھاؤ۔ اسی لیے سود کے بارے میں حدیث مبارکہ ہے:

((دِرْهَمٌ رِبًا يَأْكُلُهُ الرَّجُلُ وَهُوَ يَعْلَمُ أَشَدُّ مِنْ سِتَّةٍ وَثَلَاثِينَ زَنْيَةً))[1]

''سود کا ایک درہم لینا چھتیس دفعہ زنا کرنے سے زیادہ سخت گناہ ہے۔''

زنا کاری کا برا ہونا تو ہم پر واضح ہے لیکن سود کھانا برا نہیں سمجھا جاتا۔ دراصل منکر میں پڑنا ہی انسان کو بے حیا بنا دیتا ہے۔ جب اللہ کا خوف نہ ہو، آخرت کا ڈر نہ ہو، شریعت کی پروا نہ ہو، تو بندہ بے حیا ہو کر رہ جاتا ہے۔

---

(1) مسند احمد، مسند الانصار، حدیث عبداللہ بن حنظلۃ رضی اللہ عنہ

اسی طرح شراب کو حرام کیا اُس کی ایک وجہ یہ ہے کہ یہ انسان کو اپنی حفاظت سے غافل کر دیتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان میں دو حفاظتی قوتیں رکھی ہیں، ایک ہے خوف اور دوسری ہے حیا۔ شراب ان دونوں جبلّی حسیات (instincts) کو دبا دیتی ہے۔ نشے کی حالت میں انسان ایسے ایسے بے حیائی کے کام کر جاتا ہے جو عام طور پر کبھی نہ کرے۔

''حیا'' اور ''حیات'' دونوں لفظوں کا مادہ (root) ایک ہی ہے۔ اگر حیا ہے تو حیات ہے اور اگر حیا مٹ جائے تو پھر معاشرے کی انفرادی و اجتماعی زندگی خطرے کا شکار ہو جاتی ہے۔

حیا کا روایتی تصور:

جب ہم حیا کی بات کرتے ہیں تو ہمارے ذہنوں میں حیا کا ایک روایتی سا تصور آتا ہے۔ ایک خاص قسم کی وضع قطع کو حیا سمجھا جاتا ہے اور حیا کو صرف عورت کے ساتھ مخصوص سمجھا جاتا ہے کہ حیا تو بس عورت کو کرنی چاہیے حالانکہ ایک خاص وضع قطع اختیار کرنا اور عورت کا حیادار ہونا ''حیا'' کا حصّہ ہے مگر یہ کُل حیا نہیں ہے۔ دوسری طرف حیا کو کمزوری یا کم ہمتی یا اعتماد کی کمی (under confidence) کے ساتھ نتھی کر دیا جاتا ہے کہ شاید تعلیم کی کمی کی وجہ سے حیا پیدا ہوتی ہے، یہ کسی کمزوری کی علامت ہے۔ یہ بھی ایک انتہا (extreme) ہے۔

دراصل حیا ایک پورا رویّہ (attitude) ہے، خالق اور مخلوق دونوں کے ساتھ درست رویّے کا نظام ہے۔ خالق کے ساتھ جب حیا ہوگی تو اللہ کے ساتھ ہمارا رویّہ درست رہے گا اور مخلوق کے ساتھ بھی ہم حیا رکھیں گے تو یہاں بھی ہمارا رویہ درست رہے گا۔ حیا کی حیثیت انسان کے دماغ میں محافظ کی سی ہے۔ حیا انسان کی فطرت کی بھی محافظ ہے اور انسان کی عقل کی بھی محافظ ہے۔ جو خیالات آتے ہیں اُن کو حیا چھان دیتی ہے۔

حیا ایک پورے رویّے کا نام ہے:

ایک طرح سے یوں سمجھیں کہ حیا ایک چھلنی کی طرح ہے جس میں سے سوچ اور خیالات چھن کر نکلتے ہیں، بُرے خیالات چھٹ جاتے ہیں، اچھے خیالات اور سوچ پروان چڑھتے ہیں اور عمل میں نمودار ہوتے ہیں اور یہی تو تزکیہ ہے کہ انسان کے خیالات پاکیزہ ہو جائیں۔ تو پتہ چلا کہ تزکیہ حاصل کرنے کے لیے باحیا ہونا نہایت ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ سے حیا:

اللہ تعالیٰ سے درست تعلق کی بنیاد کیا ہے؟ اللہ تعالیٰ سے صحیح تعلق کی بنیاد دو چیزوں پر ہے۔ ''الحیا'' اور ''الذُّل''، ''حیا کا ہونا'' اور ''عاجزی کا ہونا''۔ اگر انسان میں یہ دو خصوصیات ہیں تو اللہ سے اُس کا رویّہ درست ہو جائے گا۔ اللہ سب سے اس بات کا زیادہ حق دار ہے کہ اُس سے حیا کی

جائے۔ ترمذی میں حدیثِ مبارکہ ہے، حضرت عبداللہ ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اِسْتَحْیُوا مِنَ اللّٰہِ حَقَّ الْحَیَاءِ)) (۱)

''اللہ تعالیٰ سے ایسی حیا کرو جیسی اُس سے حیا کرنی چاہیے۔''

مخاطبین نے عرض کیا: الحمدللہ! ہم اللہ سے حیا کرتے ہیں۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، ''نہیں!'' یعنی حیا کا مفہوم اتنا محدود نہیں جتنا تم سمجھ رہے ہو۔ بلکہ اللہ سے حیا کرنے کا حق یہ ہے کہ تم سر اور سر میں جو خیالات اُن سب کی نگرانی کرو اور پیٹ اور اُس کے متعلقات کی حفاظت کرو۔ یعنی دماغ کو فحش خیالات سے اور پیٹ کو حرام غذا سے بچاؤ۔ اور موت کے بعد قبر میں جو حالت ہونی ہے اُس کو یاد کرو اور جو شخص آخرت کو اپنا مقصد بنائے گا وہ دنیا کی آرائش اور عشرت سے دستبردار ہو جائے گا اور اس چند روزہ زندگی کے عیش کے مقابلے میں آگے آنے والی زندگی کی کامیابی کو اپنے لیے پسند اور اختیار کرے گا۔ بس جس نے یہ کیا تو سمجھو اللہ سے حیا کرنے کا حق اُس نے ادا کر دیا۔

تو پتہ چلا کہ اللہ تعالیٰ سے بھی حیا ہوتی ہے۔ جب انسان تنہا ہوتا ہے اُس وقت بھی اللہ سے حیا کرنی چاہیے۔ اپنے خیالات کی نگرانی کرنی چاہیے۔ سوچ تو ایسی چیز ہے جو کسی کو سنائی نہیں دیتی، صرف ہم ہی جانتے ہیں کہ ہم کیا سوچ رہے ہیں۔ دیکھیں اللہ تعالیٰ نے بھی ہمارا کیسا پردہ رکھا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے خیالات کو لوگوں کی نظروں سے اُوجھل کر دیا، یہ ہمارا پردہ ہے۔ لیکن یاد رکھیں کہ انسان کی سوچ اور اللہ کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہے، اللہ سب جانتا ہے۔ ہمارے شعور میں اور ہمارے لاشعور میں جو کچھ ہے وہ سب اللہ جانتا ہے۔ تو انسان اپنے خیالات کے بارے میں بھی اللہ کا تقویٰ اختیار کرے۔ بُرے خیالات یا بُری سوچ آ جائے تو فوراً استغفار کرنا چاہیے۔

اللہ سے حیا کرنے کا ایک اظہار اس طرح بھی ہوگا کہ انسان کبھی تنہائی میں بھی بے لباس نہ ہو۔ خواہ کوئی نہیں دیکھ رہا لیکن اللہ تو موجود ہے، فرشتے تو ہیں۔ شیطان ہمیں وہاں سے دیکھتا ہے جہاں سے ہم اُس کو نہیں دیکھ سکتے۔ ہاں کوئی شرعی ضرورت ہو تو اجازت ہے لیکن اُس وقت کی بھی مسنون دُعائیں ہیں جن کو پڑھنا چاہیے۔

والدین سے حیا:

اللہ کے بعد انسانوں میں سب سے بڑا حق والدین کا ہوتا ہے۔ تو والدین سے بھی حیا کرنی

(۱) جامع الترمذی، کتاب صفۃ القیامۃ والرقائق والورع، باب منہ

چاہیے۔ والدین سے حیا کا ایک بالکل غلط تصور رواج پا گیا ہے کہ بعض مسائل بچے والدین سے نہیں پوچھ پاتے، اس لیے کہ انہیں شرم آتی ہے۔ مثلاً بلوغت کے بعد جسمانی تبدیلیاں (physical and emotional changes) پیدا ہوتی ہیں۔ تو بچے اپنے ماں باپ سے یہ بیان (discuss) ہی نہیں کر پاتے، کہتے ہیں ہمیں شرم آتی ہے۔ اس طرح کی شرم اچھی نہیں۔ بعض دفعہ والدین بھی بچوں سے بات کرتے ہوئے شرماتے ہیں، یہ شرم مناسب نہیں۔ والدین سے حیا اس بات میں ہونی چاہیے کہ وہ کام کرتے ہوئے شرم آئے جن سے والدین ناراض ہوتے ہوں یا اُن کی عزت پر حرف آئے۔ یا انھیں شرمندگی اُٹھانی پڑے۔ پہلے زمانے میں بچے کوئی غلط کام کرتے تھے تو اُن سے کہا جاتا تھا کہ تم کو شرم آنی چاہیے! اور ماں باپ بچوں کو تاکید کرتے تھے کہ دیکھو کوئی ایسا کام نہ کرنا کہ ہمیں شرمندگی اُٹھانی پڑے تو اُن کو ماں باپ کی عزت کا خیال رہتا تھا۔ اس جملے سے بڑھ کر کوئی تنبیہ نہیں ہوتی تھی کہ تمہیں شرم نہیں آتی، یہ آخری (ultimate) ڈانٹ ہوتی تھی یعنی غلط کام کرنے پر بچے کو غلطی کا احساس دلایا جاتا تھا تاکہ شرمندگی (guilt) کا شعور جاگے۔ یوں سمجھیں کہ خود بچے کو ایک طرح سے خود پر حاکم (judge) بنانے کی تربیت دی جاتی تھی کہ اُسے آئندہ کسی کے کہنے کی ضرورت نہ پیش آئے۔ وہ خود جانچ سکے، اچھا کیا ہے بُرا کیا ہے۔ شعور بیدار کیا جاتا تھا تو شرم کی وجہ سے وہ اس غلطی کو درست کرتا تھا اپنے کیے پر شرمندہ ہوتا تھا اور آئندہ اپنی اُس غلطی سے بچنے کی کوشش کرتا تھا۔

موجودہ دور میں حیا کی جگہ بے حیائی نے لے لی:

بچے کو شرم کا احساس دِلا کر دو چیزیں دی جاتی ہیں۔ ایک بہتری کی ترغیب دی جا رہی ہوتی ہے اور دوسرے بچے کو خود اپنے بارے میں باشعور کیا جا رہا ہوتا ہے تاکہ خود اپنے آپ کو (judge) کر لے۔ ہمارے بزرگوں کا یہی طریقۂ تربیت تھا لیکن اب اس سے منع کیا جاتا ہے۔ کہتے ہیں شرم و ندامت (guilt، shame) کا کلچر نہیں ہونا چاہیے، جو بچے کرتے ہیں اُن کو کرنے دو۔ اگر تم بچوں کو روکو گے تو ان کے اندر احساسِ جرم پیدا ہوگا، احساسِ کمتری پیدا ہوگی، ان کی شخصیت مسخ (distort) ہو جائے گی۔ اب علمِ نفسیات (Psychology) نے اس پشیمانی اور شرم کو قابلِ مذمت عمل قرار دے دیا۔ لہٰذا اب حیا شخصیت کی خوبی نہیں بلکہ شخصیت کا عیب بن گئی ہے۔ اور جن کے اندر حیا نہیں اُن لوگوں کو بہادر (bold) اور بااعتماد (confident) سمجھا جانے لگا، اعتماد (confidence) اور سرکشی (defiance) کے مابین فرق نہ رہا، اب شیطان کو اور کیا چاہیے۔

جونہی فطرت کے محافظ کی چھٹی کی، شیطان تو پوری فوج لے کر حملہ آور ہو گیا، ہر طرح سے بے حیائی کو مزین کر دیا، خوبصورت بنا کر پیش کیا۔ ایک طرف برقی (electronic) اور مطبوعہ (print) میڈیا کی طرف سے ذہن سازی (brain washing) شروع ہو گئی۔ قلوب و اذہان میں یہ بات بٹھا دی گئی کہ حیا مردانگی کے خلاف ہے اور یہ تصور دیا گیا کہ جو مرد جتنا زیادہ نڈر اور بہادر ہو گا، اتنا ہی زیادہ بے حیا ہو گا۔ مثلاً یہ قانون نافذ کرنے والے سپاہی (law enforcement soldiers) جن کو عام طور پر بہادر سمجھا جاتا ہے وہ بغیر گالی کے بات ہی نہیں کرتے تو اس طرح رفتہ رفتہ حیا کا تصور مٹتا چلا گیا۔ شیطان نے بے حیائی کو بڑا خوبصورت بنا دیا۔

{وَاِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ اَعْمَالَهُمْ} (الانفال: ۴۸)

''اور جب شیطان نے اُن کے لیے اُن کے برے اعمال مزین کر دیئے۔''

اس طرح حیا کو مردوں میں سے ختم کر دیا گیا۔ آج اگر کسی لڑکے کو یہ کہہ دیا جائے کہ یہ شرمیلا ہے تو اُس کے لیے اس سے بڑی کوئی بے عزتی نہیں ہو سکتی۔ یا کسی لڑکے کو یہ کہہ دینا کہ بڑا شریف ہے تو اُس کی مردانگی پر بن آتی ہے۔ اب جب معاشرے میں ہم مردانگی کے اس مسخ شدہ معیار (distorted image) کو اپناتے ہیں اور اسی کو مردانگی سمجھنے لگتے ہیں تو پھر ظاہر ہے کہ معاشرے میں فساد ہی مچے گا، بے راہ روی عام ہو گی، عزتیں کہاں محفوظ رہیں گی۔ بے حیائی کی وجہ سے زن و شو کے تعلق میں خرابی آ جاتی ہے اس لیے کہ مرد عورت کے تعلق میں جو پردہ ہے وہ تو حیا کا ہے۔ مرد اور عورت کا صحیح تعلق استوار ہو نہیں سکتا اگر اُن کے اندر حیا نہ ہو، جب حیا اُٹھ جائے گی تو تعلقات بگڑ جائیں گے۔

بچوں کو حیا کی راہ پر ڈالیں:

بچوں کے حوالے سے ہم دیکھتے ہیں کہ آج نوجوانوں نے رول ماڈل (role model) بُرے لوگوں کو بنایا ہوا ہے تو اس میں والدین کا بھی قصور ہے۔ والدین اُن کو صحیح رول ماڈل (role model) نہ دے پائے۔ ایسے بھی لوگ دنیا میں گزرے ہیں جو انتہائی جری بہادر تھے۔ انتہائی کرشماتی (charismatic) تھے، دنیا کی تاریخ پر گہرا اثر ڈالا، جنگیں بھی لڑتے تھے اور ساتھ ساتھ انتہائی باحیا بھی تھے، نظریں نیچی رکھنے والے تھے۔ اپنی عزت کی حفاظت کرنے والے تھے،

زنا سے بچنے والے تھے، زنا کو بہت بُرا اور گناہ سمجھتے تھے۔ اس کی مذمت (condemn) کرتے تھے۔ تو ہم اپنے بچوں کو کیوں نہ ایسی شخصیات یعنی صحابہ کرام ؓ کے بارے میں بتائیں۔ اپنے بچوں کو صحابہ ؓ کی زندگیوں کے بارے میں لکھی گئی کتابوں سے متعارف کرائیں۔ تاکہ بجائے اِدھر اُدھر کی کہانیوں کے ان اعلیٰ ترین لوگوں کے بارے میں پڑھیں، حضرت ابوبکر صدیق ؓ، حضرت عمر فاروق ؓ، حضرت عثمان ؓ، حضرت علی ؓ کے بارے میں بتائیں تاکہ ان کے کردار کی تعمیر اسی طرز پر ہو کہ یہ لوگ کیسے بہادر اور باحیا تھے، کیا زبردست لوگ تھے۔

خود نبی اکرم ﷺ کے بارے میں آتا ہے کہ:

((كَانَ النَّبِيُّ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ أَشَدَّ حَيَاءً مِنَ الْعَذْرَاءِ فِي خِدْرِهَا))[1]

"آپ ﷺ غیر شادی شدہ لڑکی سے زیادہ حیادار تھے۔"

آپ ﷺ کے اندر اتنی شرم اور حیا تھی اور آپ ﷺ کے تمام ساتھیوں میں بھی یہ خوبی پائی جاتی تھی، مکمل ستر ڈھانپنے والا لباس پہنتے تھے۔ نبی اکرم ﷺ نے کسی زندہ یا مردہ انسان کی ران (thigh) پر نظر ڈالنے سے منع فرمایا ہے۔ اسلام میں اتنی حیا ہے کہ جب مردے کو بھی نہلایا جاتا ہے تو اُس کے پردے کا خاص خیال رکھا جاتا ہے۔ موٹی چادر اوپر ڈالی جاتی ہے اور چادر کے نیچے سے نہلایا جاتا ہے تاکہ جسم نہ کھلے۔ تو مردے کی ران پر بھی نظر ڈالنے سے منع فرمایا گیا ہے۔ کجا یہ کہ مرد عورتیں، لڑکے لڑکیاں نیم عریاں حالت میں بازاروں میں گھومیں پھریں۔

حیا بہادری و مردانگی دکھانے میں رکاوٹ نہیں:

صحابہ کرام ؓ نے ان تعلیمات پر عمل کیا لیکن یہ تعلیمات قیادت و سیادت میں حائل نہیں ہوئیں، حیا رکاوٹ (impediment) نہیں بنی، بہادری، مردانگی کی راہ میں، جنگیں لڑیں اور جیتیں، دشمنوں اور اسلام کے مخالفین کے چھکے چھڑا دیئے۔ صحابہ ؓ نے کھیل بھی کھیلے، تیراکی بھی کی اور فاتحین عالم بھی قرار پائے لیکن ستر کبھی نہ کھلے۔ تو زندگی میں بھرپور حصہ لینے کے لیے یا ترقی کے لیے ستر کا کھلنا کوئی شرط نہیں۔ حضرت عثمان غنی ؓ بہت زیادہ حیادار تھے۔ نبی اکرم ﷺ نے

---

(1) صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب الحیاء

فرمایا ہے ((أَصْدَقُهُمْ حَيَاءً عُثمان رضی اللہ عنہ)) (۱) ''سب سے زیادہ حیا کرنے والے عثمان رضی اللہ عنہ ہیں۔'' خلاصہ یہ ہے کہ اسلام کا نظریہ یہ نہیں ہے کہ حیا صرف عورت کے لیے ضروری ہے اور مرد کے لیے ضروری نہیں۔ مرد کے لیے بھی حیا اتنی ہی ضروری ہے جتنی عورت کے لیے ضروری ہے۔

لڑکے کیا، لڑکیاں بھی حیا کھو بیٹھیں:

جب ہم فطرت سے دُور ہٹے تو بیٹوں کو باحیا بنانے کی بجائے اپنی بیٹیوں کو بھی حیا سے محروم کر دیا۔ ہم نے کہا کہ ہم اپنے بچوں میں برابری (equality) کریں گے۔ چلیں برابری (equality) بھی کرنی ہی تھی تو لڑکوں میں حیا کی صفت اور خوبی پیدا کرتے، لیکن ہم نے ظلم یہ کیا کہ بیٹے تو حیا سے عاری تھے ہی، بیٹیوں کو بھی حیا کے زیور سے محروم کر دیا۔ اب لڑکیاں بھی شرم وحیا کو اچھا نہیں سمجھتیں۔ بے حیائی (immodest) کو وہ بھی اعتماد (confidence) اور بہادری (bold) سمجھتی ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے حیا کا تصور قرآن سے سیکھا ہی نہیں۔

حیا کی زندگی:

نہ ہم نے صحابہ رضی اللہ عنہم کو سامنے رکھا' نہ ازواجِ مطہرات کو، نہ صحابیات رضی اللہ عنہن کو' نہ قرآن کی تعلیمات کو ماڈل بنایا۔ کاش! ہماری زندگی میں قرآن کا نور ہوتا تو ہمیں حضرت مریم علیہا السلام کا کردار نظر آتا کہ باحیا لڑکی کیسی ہوتی ہے، کیسی باوقار (dignified) ہوتی ہے، کیسی پُراعتماد ہوتی ہے۔ وقت پڑے تو پورے اعتماد سے مردوں سے بات کرتی ہے۔ اور کاش! ہم نے قرآن سمجھا ہوتا تو پتہ چلتا کہ گھر سے باہر نکل کر کام کرنے کی ضرورت پیش آئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ہونے والی زوجہ کی طرح حیا کے ساتھ کام بھی کرتی ہیں۔

{فَجَآئَتْهُ اِحْدٰىهُمَا تَمْشِيْ عَلَى اسْتِحْيَآءٍ} (قصص: ۲۵)

''تو اُن دونوں عورتوں میں سے ایک عورت آئی حیا کے ساتھ چلتی ہوئی۔''

تو حیا دراصل نامحرم مرد اور عورت کے درمیان تعلق کا بنیادی تقاضا ہے، معاملہ کرنے کا ایک طریقہ ہے۔ ایک حد بندی (distance) کے ساتھ معاملہ کرنا، ایک دوسرے کی ذات پر توجہ مرکوز کرنے کے بجائے صرف موضوع پر توجہ رکھنا، پورے اعتماد (confidence) کے ساتھ

---

(۱) جامع الترمذی، کتاب المناقب، مناقب معاذ بن جبل و زید بن ثابت رضی اللہ عنہم

معاملہ کرنا ہے۔ بات چیت میں گھٹیا پن نہ ہو، لبھانے (flirtation) کا سا انداز نہ ہو۔

حیا کا تقاضا:

حیا کا آغاز سوچ سے ہوتا ہے، جذبات سے ہوتا ہے۔ پہلے یہ ارادہ کرلیں کہ ہمیں حیا کرنی ہے اور پھر اس کا اظہار جسم اور لباس وغیرہ سے ہوگا۔ صد افسوس کہ آج "TV" کے ڈراموں نے، فلموں نے، فحش ناولوں نے حیا کے احساس کو بالکل ختم کر دیا۔ حیا ہمارے معاشرے سے ایسے اُٹھی کہ اب جو کچھ دکھایا جاتا ہے وہ انسان زبان پر نہیں لاسکتا۔ سورۃ الانعام میں ارشاد الٰہی ہے۔

{وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ} (۱۵۱)

''تم بے حیائی کے قریب بھی مت جاؤ، نہ ظاہر نہ پوشیدہ۔''

تو یہ حیا کا تقاضا ہے کہ بندہ اخلاق باختہ مناظر نہ دیکھے، آنکھوں کو خیانت سے بچانا ہے، آنکھوں کا بھی پردہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو دیکھنے سے منع فرمادیا ہے انسان اُن کو نہ دیکھے۔ نہ تنہائی میں بیٹھ کر کوئی ایسی چیز دیکھی جائے اور نہ بچوں کے ساتھ بیٹھ کر۔ انسان یہ معیار بنا لے کہ جو چیزیں بچوں کے ساتھ بیٹھ کر نہیں دیکھ سکتے وہ تنہائی میں بھی بیٹھ کر نہیں دیکھیں گے، شوہر کے ساتھ بیٹھ کر بھی نہیں دیکھیں گے، اس لیے کہ اللہ تو دیکھ رہا ہے۔ انسان کے ضمیر کو تو پتہ ہے کہ یہ غلط کام ہے۔

جسم اور ذاتی معاملات کے بارے میں حیا:

اسی طرح اپنے جسم کے بارے میں حیا ضروری ہے۔ انسان کو محتاط رہنا چاہیے کہ جسم کہیں کھل نہ جائے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

{يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا} (الاعراف: ۲۶)

''اے آدم کے بچو! ہم نے تمہارے لیے لباس نازل فرمایا ہے۔ جو تمہارے جسم کے قابل شرم حصوں کو ڈھانپنے والا ہے اور موجب زینت بھی۔''

تو ایسا لباس پہننا چاہیے جس میں جسم نمایاں نہ ہو، پورا ڈھک جائے، ساتر لباس ہو۔ تنہائی میں بھی انسان بے لباس نہ رہے۔ کسی بھی شرعی ضرورت کے بغیر جسم نہ کھولا جائے۔ یہ جسم کے بارے میں حیا کے احکام ہیں۔

معاملات میں حیا یہ ہے کہ جو معاملات تنہائی میں ہوتے ہیں جن میں کہ جسم کھلتا ہے اُن کا ذکر کسی کے سامنے نہ کیا جائے۔ حضرت عبدالرحمن بن عوف ؓ مشہور صحابی تھے۔ اُن کا نکاح ہوا تو صبح کو بے تکلف دوستوں نے پوچھا کہ رات کیسی گزری؟ اُنھوں نے نظر انداز کر دیا، جب دوستوں نے زیادہ اصرار کیا تو آپ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے اسی لیے دروازے اور تالے بنائے ہیں کہ جائز اور مباح کام بند دروازوں کے پیچھے ہو اور جب اُس کا ذکر کھلم کھلا شروع ہو جائے تو یہ چیز بے حیائی میں شامل ہو جاتی ہے۔'' تو ازدواجی زندگی کے بارے میں گفتگو کرنا یا چھیڑ چھاڑ کرنا اچھی بات نہیں ہے۔ یہ نہ تو خود اعتمادی کی علامت ہے کہ ہم اپنے راز کے معاملات بھی اوروں کے سامنے کھول کر بیان کر دیتے ہیں۔ اور نہ ہی یہ اپنائیت کی علامت ہے۔ جیسے بعض لوگ کہتے ہیں کہ ہم دوستوں میں کوئی بات پوشیدہ (secret) نہیں ہے، ہم تو آپس میں ہر بات کرتے ہیں۔ یہ ذاتی (private) باتیں دوسروں کو بتانا مناسب نہیں ہے، نہ دوسروں کی ازدواجی زندگی کے بارے میں کھود کرید کرنا چاہیے۔

حیا اور بے حیائی کی تاثیر:

اسی طرح حیا ہی انسان کو رواداری سکھاتی ہے، مروت اور لحاظ سکھاتی ہے۔ بڑوں بزرگوں کے سامنے انسان زبان درازی نہیں کرتا، بدتمیزی کرتے ہوئے شرم آتی ہے۔ یہ حیا کی وجہ سے ہوتا ہے۔ بڑے غلط بات بھی کہہ رہے ہوں تو ہمت نہیں ہوتی کہ اُن کو ٹوک دیں یا تصحیح کر دیں۔ کُجا یہ کہ اُن کو ترکی بہ ترکی جواب دیا جائے۔ شرم اور حیا رکاوٹ بن جاتی ہے اور زبان کے غلط استعمال سے انسان کو بچا لیتی ہے۔ بے حیائی کی وجہ سے چہرے کا نور چلا جاتا ہے۔ چہرے بے رونق ہو جاتے ہیں۔

نبی اکرم ﷺ کا تو حال یہ تھا کہ کوئی ناگوار بات بھی آپؐ کے سامنے ہوتی تو آپ ﷺ زبان سے نہیں کہتے تھے۔ صحابہ ؓ فرماتے ہیں اگر کوئی چیز آپ ﷺ کو بُری لگتی تھی ہم آپ ﷺ کے چہرے سے پہچان جاتے تھے۔'' یعنی آپ ﷺ کی حتی الامکان کوشش ہوتی تھی کہ آپ ﷺ زبان سے تنقید نہ کریں، کسی چیز کو بُرا نہ کہیں۔

اس کے علاوہ بے باکی سے ہر چیز پر تبصرہ کرنا، تنقید شروع کر دینا، سب کو بُرا بھلا کہنا شروع

کر دینا یہ بھی حیا کی قِلّت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ غیبت کرنا، طنز و طعنہ کے ذریعے کسی کی عزت کو تار تار کر دینا، بے دھڑک کسی کا مذاق اُڑانا یہ سب بے حیائی کے مظاہر ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ حیا کا مطلب فقط "پردہ" ہے، بس چہرہ ڈھانپ (cover) لو تو حیا کا تقاضا پورا ہو جائے گا۔ حالانکہ یہ حیا کا بس ایک حصّہ ہے، حیا کا کامل تصور نہیں ہے۔ تو معاملات سے، بات چیت کے انداز سے، حرکات و سکنات سے حیا چھلکنی چاہیے۔ انسان کے شقی اور بدبخت ہونے کی ایک علامت یہ ہے کہ وہ "قِلَّةُ الْحَيَا" (lack of modesty) ہو۔ حیا زبان کے غلط استعمال سے بھی باز رکھتی ہے اور اس سے مروّت بھی پیدا ہوتی ہے۔ کسی کو خالی ہاتھ کیسے لوٹائیں، کوئی مدد طلب کرے تو کیسے مدد نہ کریں۔ دل چاہتا ہے آپ کے پاس سے کوئی خالی ہاتھ نہ لوٹے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی بھی شان ہے۔ حدیثِ مبارکہ میں مضمون آتا ہے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((اِنَّ رَبَّكُمْ تَبَارَكَ وَتَعَالٰى حَيِيٌّ كَرِيْمٌ يَسْتَحْيِي مِنْ عَبْدِهٖ اِذَا رَفَعَ يَدَيْهِ اِلَيْهِ اَنْ يَرُدَّهُمَا صِفْرًا))[1]

"بے شک تمھارے رب میں حیا اور کرم کی صفت ہے۔ اللہ تعالیٰ اس بات سے شرماتا ہے کہ اس کا بندہ اُس کے آگے ہاتھ پھیلائے اور اللہ اُس کو خالی ہاتھ لوٹا دے۔"

بچوں کی تربیت میں حیا کا خاص خیال رکھا جائے:

اپنی اولاد کی تربیت میں حیا، رواداری اور مروّت کو نہ بھولیں۔ بچپن ہی سے زبان کے بارے میں بچوں کو محتاط کریں، لباس کے بارے میں محتاط کریں۔ چھوٹی عمروں میں بھی بچوں کو عریاں (revealing) کپڑے مت پہنائیں۔ یہ اکثر بیٹیوں کے ساتھ کیا جاتا ہے جو بالکل گڑیوں کی طرح لگتی ہیں۔ بچیوں کو ضرور سجائیں، سنواریں، کلپ (clips) لگائیں، چوڑیاں پہنائیں، (hair bands)، ربن (ribbon)، فراک (frocks) جو جی چاہے پہنائیں، لیکن ایسا نہ ہو کہ وہ مغربی طرز کا ہو۔ بہت پتلا لباس، بہت تنگ لباس یا بغیر آستینوں (sleeveless) کے لباس وغیرہ سے گریز کریں۔

یہ اساتذہ کی بھی ذمہ داری ہے کہ وہ اپنے شاگردوں میں حیا کو پروان چڑھائیں، حیا کا تصور

---

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب الدعاء

اجاگر کریں۔ والدین اور استاد دونوں کا یہ کام ہے۔ ترمذی اور مسندِ احمد میں حدیث مبارکہ ہے، حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اَلْحَيَاءُ مِنَ الْإِيمَانِ وَالْإِيمَانُ فِي الْجَنَّةِ وَالْبَذَاءُ مِنَ الْجَفَاءِ وَالْجَفَاءُ فِي النَّارِ))(۱)

''حیا ایمان کی ایک شاخ ہے اور ایمان کا مقام جنت ہے۔ اور بے حیائی بدکاری میں سے ہے۔ کوڑا کرکٹ ہے، بُری چیز ہے اور بدی آگ میں لے جانے والی ہے۔''

ایک حدیث مبارکہ ہے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((لِكُلِّ دِينٍ خُلُقٌ وَخُلُقُ الْإِسْلَامِ الْحَيَاءُ))(۲)

''ہر دین کا کوئی امتیازی وصف ہوتا ہے اور اسلام کا امتیازی وصف حیا ہے۔''

ایک اور واقعہ بخاری اور مسلم میں آتا ہے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے ''نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا گزر انصار میں سے ایک شخص پر ہوا اور وہ اس وقت اپنے بھائی کو شرمیلے پن کے بارے میں نصیحت اور ملامت کر رہا تھا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا:

((دَعْهُ فَإِنَّ الْحَيَاءَ مِنَ الْإِيمَانِ))(۳)

''اس کو اس کے حال پر چھوڑ دو کیوں کہ حیا تو ایمان کا جز یا ایمان کا پھل ہے۔''

تو حیا اتنی اچھی چیز ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((اَلْحَيَاءُ لَا يَأْتِي إِلَّا بِخَيْرٍ))(۴)

''حیا صرف خیر ہی کو لاتی ہے۔''

صحیح بخاری میں ایک اور حدیث مبارکہ ہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((إِنَّ مِمَّا أَدْرَكَ النَّاسُ مِنْ كَلَامِ النُّبُوَّةِ إِذَا لَمْ تَسْتَحْيِ فَاصْنَعْ مَا شِئْتَ))(۵)

''اگلی نبوت کی باتوں میں سے جو کچھ لوگوں نے پایا ہے اُس میں سے ایک مقولہ یہ بھی ہے کہ

---

(۱) جامع الترمذی، کتاب البر والصلة، باب ماجاء فی الحیاء
(۲) موطأ امام مالک، کتاب الجامع، باب ماجاء فی الحیاء
(۳) صحیح البخاری، کتاب الایمان، باب الحیاء من الایمان
(۴) صحیح البخاری، کتاب الأدب، باب الحیاء
(۵) صحیح البخاری، کتاب احادیث الانبیاء، باب حدیث الغار

جب تم میں شرم اور حیا نہ ہو تو پھر جو چاہو کرو۔"

جب شرم نہ رہی، حیا نہ رہی ہو تو پھر جو مرضی کرو۔ پھر تمہیں کوئی بے حیائی کا کام بُرا نہیں لگے گا، عار محسوس نہیں ہوگی، سب کچھ کر گزرو گے یعنی جب حیا نہیں تو ایمان نہیں اور جب ایمان نہیں تو کون سی شے انسان کو گناہ سے روکے گی، اسی لیے حیا کو بہت زیادہ عام (promote) کرنے کی ضرورت ہے۔

دو چیزوں میں حیا نہیں:

اب دو چیزیں ایسی ہیں جن میں حیا نہیں ہونی چاہیے۔ علم سیکھنے میں اور اظہارِ حق میں۔ جہاں تک علم سیکھنے کا تعلق ہے تو ایک عربی کی مشہور کہاوت ہے کہ دو "م" والے علم حاصل نہیں کر سکتے، ایک "مُتَکَبِّر" یعنی تکبر کرنے والا اور دوسرا "مُسْتَحْیٖ" یعنی شرم کرنے والا۔ لہٰذا سیکھنے سکھانے میں حیا نہیں ہونی چاہیے۔ شرعی مسائل ہوں، پاکی ناپاکی کے مسائل ہوں، ان کو پوچھنے اور بتانے میں شرم نہیں کرنی چاہیے۔

دوسرے: حق کے اظہار میں بھی شرمانے کی ضرورت نہیں کہ فلاں بُرا منالے گا۔ یہ رواداری نہیں ہونی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ الاحزاب میں فرمایا ہے:

{وَاللّٰہُ لَا یَسْتَحْیٖ مِنَ الْحَقِّ} (۵۳)

"اللہ تعالیٰ نہیں شرماتا حق بیان کرنے سے"

تو حق بیان کر دینا چاہیے۔ پھر فرمایا:

{اِنَّ اللّٰہَ لَا یَسْتَحْیٖٓ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَۃً فَمَا فَوْقَھَا} (البقرۃ:۲۶)

"اللہ تعالیٰ نہیں شرماتا اس بات سے کہ وہ مچھر کی مثال بیان کرے یا اس سے بھی کمتر چیز کی۔"

تو علم اور حق ان دو چیزوں میں شرمانا نہیں چاہیے۔ کوئی شخص کہے کہ ہمیں تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے سے شرم آتی ہے۔ اس معاملے میں جھجک اچھی شے نہیں ہے۔

حیا حاصل کرنے کے لیے انسان کیا کرے؟ سب سے پہلے تو پوری روح کے ساتھ نماز پڑھے، نماز باحیا بنائے گی۔ جس طرح کا لباس ہم نماز میں پہنتے ہیں دیگر زندگی میں بھی ویسا ہی لباس پہننے کی کوشش کریں۔ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

{اِنَّ الصَّلٰوۃَ تَنْھٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْکَرِ}(العنکبوت:۴۵)

"بے شک نماز تو روکتی ہے فحش سے اور منکر سے"

اور حیا حاصل کرنے کے لیے ایمان کا جو سرچشمہ ہے یعنی قرآن، اس سے انسان تعلق جوڑے۔ تو اللہ تعالیٰ سے بہت دُعا کرنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اپنی عفت اور عصمت کی حفاظت کرنے والا بنادے اور اللہ ہمارے اندر حیا پیدا کردے۔ آمین

حُبّ

''حُبّ'' کے معنی ہیں ''محبت''، یہ جذبہ بھی دل کے اندر ہوتا ہے، دل کی ایک خاص کیفیت کا نام ہے۔ حُبّ اور حَبّ ملتے جلتے الفاظ ہیں۔ حُبّ کہتے ہیں محبت کو اور حَب کہتے ہیں دانے (seed) کو، بیج کو۔ انسان جس چیز کا بیج مٹی میں دباتا ہے، اُسی کا پودا نکلتا ہے اور پودے کو دیکھ کر پتا چلتا ہے کہ کس پودے یا پھل کا بیج دبایا گیا تھا۔ بالکل اِسی طرح محبت تو دل کے اندر دبی ہوتی ہے۔ اظہار جب ہم کرتے ہیں، عمل جو ہمارا ہوتا ہے۔ اُس سے پتا چلتا ہے کہ ہمیں کس سے محبت ہے؟ ہمارے دل میں کس کی محبت ہے؟ اس محبت کی نوعیت کیا ہے؟ جہاں تک محبت کا تعلق ہے، تو محبت، انتہائی مطلوب جذبہ ہے، پسندیدہ چیز ہے۔ اسلام خوش گوار جذبات کا اظہار چاہتا ہے اور ناگوار جذبات کو دبانا چاہتا ہے۔ جیسے کسی بدبودار چیز کو ڈھانپ کر رکھا جاتا ہے تاکہ بدبو نہ پھیلے، اسی طرح ناگوار بدمزگی پیدا کرتے ہیں لہٰذا خوش گوار جذبات خوشبو کی طرح ہوتے ہیں، ہوا میں پھیل کر پورے ماحول کو معطّر کر دیتے ہیں، مشامِ جاں کو فرحت پہنچاتے ہیں۔ اسی طرح اسلام چاہتا ہے کہ معاشرے کے اندر خوش گوار جذبات کا اظہار ہو۔

محبت زندگی میں چاشنی پیدا کرتی ہے، خوب صورتی اور مٹھاس لاتی ہے۔ ایک دفعہ نبی اکرم ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ سے اُن کا نام لے کر فرمایا کہ ''اے معاذ رضی اللہ عنہ مجھے تم سے محبت ہے۔'' ذرا سوچیں حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی کیا کیفیت ہوگئی ہوگی، یہ سن کر اُنہیں کتنی مسرّت اور خوشی ہوئی ہوگی۔ بعض دفعہ ہم تکلف برتتے ہیں اور بے ساختہ جذبات کا اظہار نہیں کر پاتے، کنجوسی برتتے ہیں۔ غلط فہمی (misunderstanding) کا خدشہ ہوتا ہے یا یہ کہ لوگ یہ نہ سمجھیں کہ کوئی مفاد پوشیدہ ہے، یا پھر ٹھکرائے جانے کا خوف لاحق ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے لوگ جذبات کے اظہار سے ڈرتے ہیں۔ لیکن جہاں رشتوں میں باہم اعتماد ہو، انسان اپنے نیک جذبات کا اظہار ضرور کرے۔ والدین کے ساتھ، بچوں کے ساتھ، شوہر کے ساتھ، شوہر کے والدین کے ساتھ ضرور (share) کریں کہ آپ کو اُن سے محبت ہے، یہی مشورہ ہمارے نبی اکرم ﷺ نے ایک اور صحابی رضی اللہ عنہ کو دیا تھا کہ اگر تم فلاں سے محبت کرتے ہو تو اُس کو جا کر بتاؤ تم اس سے محبت کرتے ہو۔'' اس سے اُس کا دل بھی خوش ہوگا اور تعلقات بھی بہتر ہوں گے، خوش گوار ہوں گے۔

مسند احمد میں حدیث پاک ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ راوی ہیں، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

''مومن تو محبت اور اُلفت کا مرکز ہے، اور اس آدمی میں کوئی بھلائی نہیں جو دوسروں سے کوئی محبت نہیں کرتا اور دوسرے اس سے الفت نہیں کرتے۔''

تو یہ بہت اچھی چیز ہے کہ لوگ آپ سے محبت کریں اور آپ لوگوں سے محبت کریں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ رضی اللہ عنہم آپس میں محبت کرتے تھے۔ اس لیے کہ جب آپس میں محبت ہوتی ہے، تو یقین بھی ہوتا ہے، اعتماد بھی ہوتا ہے اور محبت بڑا زبردست جذبۂ محرکہ (motivating factor) ہے۔ یہ قربانیاں دینا سکھاتا ہے۔ بڑے سے بڑے مشکل مرحلوں کو محبت آسان کر دیتی ہے۔ بڑے بڑے ناگوار حالات بندہ جھیل جاتا ہے فقط محبت کی وجہ سے۔ کیوں کہ محبت چاشنی اور مٹھاس ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو خطاب کر کے فرمایا ہے کہ:

{وَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ۭ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ۭ} (الانفال: ۶۳)

''اللہ نے مومنوں کے دلوں میں محبت ڈال دی، ان کے دل جوڑ دیے۔ اگر آپ زمین بھر کی دولت خرچ کر دیتے تو بھی اُن کے دلوں میں محبت پیدا نہ کر سکتے تھے۔''

ہمیں بھی چاہیے اللہ سے دعا کریں:

((اَللّٰهُمَّ اَلِّفْ بَيْنَ قُلُوْبِنَا وَاَصْلِحْ ذَاتَ بَيْنِنَا)) (۱)

''اے اللہ ہمارے دلوں میں الفت پیدا کر دے، اور ہمارے معاملات کی اصلاح کر دے۔''

ایک دفعہ محبت پیدا ہو جائے، تو بدگمانی اور بدظنی ہونے کے امکانات بھی بہت کم ہو جاتے ہیں۔ اگر آپ کو کسی سے محبت ہے اور کوئی اس کے بارے میں آپ کو کوئی بُری بات کہے تو آپ فوراً اس کا دفاع (defend) کریں گے کہ یہ نہیں ہو سکتا وہ ایسا کہہ ہی نہیں سکتا۔ اُس کا مطلب وہ نہیں ہوگا وغیرہ وغیرہ اور کوئی کام آپ کو کتنا بھی ناگوار لگتا ہو لیکن محبت اس کو آسان کر دیتی ہے۔ مائیں کیسے راتوں کو بچوں کے لیے جاگتی ہیں۔ یہ محبت ہی کا جذبہ ہے جو جگاتا ہے، یہ ممتا ہے، محبت ہے اور یہ بہت ہی زبردست جذبہ ہے۔

شیطان محبت کا غلط استعمال سکھاتا ہے:

جب محبت اتنی طاقت ور ہے تو سوچیں کیا شیطان اس محبت کے جذبے سے بے گانہ رہے گا؟

---

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب الصلاۃ، باب التشہد

اس پر حملہ آور نہ ہوگا؟ کیا اِس محبت کو اپنے قبضے میں کرنے کی کوشش نہ کرے گا؟ محبت کا غلط استعمال نہ سکھائے گا؟ شیطان ضرور اس جذبے سے انسان کو گمراہ کرتا ہے اور اُسے باور کراتا ہے کہ یہ اُس کے اپنے دل کی بات ہے، اُس کی اپنی ذات سے یہ جذبہ پھوٹا ہے، کسی خارجی قوت کا اس میں عمل دخل نہیں ہے۔

محبت کی اقسام:

اب ہم دیکھیں گے محبت کی کتنی قسمیں ہیں، کس سے کریں؟ کتنی کریں؟ کہاں بے انتہا اور کہاں محدود کریں؟ اور کس سے محبت نہ کریں۔ علماء کا کہنا یہ ہے کہ محبت کی ۴ اقسام ہیں:

☆ واجب محبت ☆ مباح محبت ☆ مکروہ محبت ☆ حرام محبت

واجب محبت:

کچھ محبتیں ایسی ہیں جو ہم پر واجب ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

{وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ} (البقرۃ:۱۶۵)

''ایمان والے تو اللہ تعالیٰ کی محبت میں شدید تر ہوتے ہیں۔''

لہٰذا اللہ سے شدید محبت ہونی چاہیے۔ پیار کسی سے بھی ہوسکتا ہے اور اپنائیت کسی سے بھی ہوسکتی ہے اور کوئی بھی دل ونظر کو بھا سکتا ہے لیکن محبت اور وفاداریاں صرف اللہ سے وابستہ ہونی چاہیں۔ یا چلیں محبت بھی کسی سے ہوسکتی ہے لیکن ''عشق'' (adoration) صرف اور صرف اللہ کے لیے ہونا چاہیے۔ انسان کو اللہ کا عاشق اور دیوانہ ہونا چاہیے۔ اللہ ہی کا نام، اللہ ہی کا کلام، اللہ ہی کا ذکر، اللہ ہی کے کام انسان کی زندگی کا مقصد اور دل کی ٹھنڈک بن جائیں۔ اللہ کی رضا زندگی کا حاصل بن جائے۔

حدیثِ پاک میں آتا ہے۔ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

((أَفْضَلُ الْأَعْمَالِ الْحُبُّ فِي اللّٰهِ وَالْبُغْضُ فِي اللّٰهِ)) (۱)

''بندوں کے اعمال میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ محبوب وہ محبت ہے جو اللہ کے لیے ہو۔ اور وہ بغض وعداوت ہے جو اللہ کے لیے ہو۔''

سو اللہ کو پہلے دِل کی مسند پر بٹھا دیں! اللہ بادشاہ ہے۔ سب سے پہلے اور سب سے زیادہ محبت اللہ سے کرنی ہے۔ اور جو لوگ اللہ سے محبت نہیں کر پاتے وہ سراسر اپنی غفلت کی وجہ سے نہیں کر پاتے۔ اور قرآن کیا ہے؟ ذِکر، یاددہانی ہے، قرآن آپ کو طریقے بتا دیتا ہے کہ تم کون سے

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب السنۃ، باب مُجَانَبَةِ أَهْلِ الْأَهْوَاءِ وَبُغْضِهِمْ

طریقے اختیار کرو گے تو تمھیں اللہ سے محبت ہو جائے گی۔ جو اللہ سے محبت کرنا چاہتا ہے وہ اللہ کا کلام پڑھ لے تو پھر اس کو اپنے محبوب کی نشانیاں اَنفُس و آفاق میں نظر آنے لگیں گی۔

اللہ سے محبت میں اپنا ہی سکون و اطمینان ہے:

جب ہم اللہ سے شدید محبت کرتے ہیں تو کیا اس کا کوئی فائدہ اللہ کو ہوتا ہے؟ اللہ تو ہماری محبتوں اور عبادتوں سے بے نیاز ہے۔ جو اللہ سے محبت کرتا ہے وہ اپنی زندگی خوشیوں، سکون اور اطمینان سے بھر لیتا ہے، اُس کو فطری و روحانی آسودگی حاصل ہو جاتی ہے۔ وہ خود خوش رہتا ہے۔ تو اللہ سے ہمیں محبت کرنی چاہیے۔

انسانوں سے محبت بھی اللہ کی خاطر ہو:

انسانوں سے بھی اللہ کی خاطر محبت کرنی چاہیے۔ اپنی ساری محبتوں کو انسان اللہ کی محبت کے تابع کر دے، اللہ کی محبت سے منسلک کر دے، اُس کی ایک محبت کا اظہار اُس کی مخلوق سے محبت کی صورت میں ہو۔ پھر آپ دیکھیں گے دنیا کی جتنی مباح محبتیں ہیں وہ کبھی آپ کے لیے رنج و الم، دکھ اور تکلیف کا سبب نہیں بن سکیں گی۔ پھر دنیا کی یہ مباح محبتیں مجبوری، محتاجی اور کمزوری نہیں بنتیں۔ ہم پھر اِن محبتوں کے محتاج نہیں رہتے بلکہ پھر یہ ساری محبتیں، انسان کی قوت بن جاتی ہیں۔ جنت حاصل کرنے میں معاون بن جاتی ہیں۔ یہ محبتیں کبھی بھی اللہ اور بندے کے درمیان حائل نہیں ہوتیں، رکاوٹ (barrier) نہیں بنتیں، بلکہ یہ محبتیں اللہ تک پہنچنے کا ذریعہ بن جاتی ہیں۔ لیکن یہ اُس وقت ہوتا ہے جب اِن سب چیزوں کو اللہ کی محبت کا تابع رکھا جائے۔

اللہ کے لیے ایک دوسرے سے محبت کرنے کی فضیلت:

مسند احمد میں حدیث پاک ہے ابی عمامۃ سے روایت ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

''جس بندے نے بھی اللہ کے لیے کسی بندے سے محبت کی اس نے اپنے رب ہی کی عظمت اور توقیر کی''

ہر محبت کو اللہ کی محبت کے تابع کرنے سے یہ محبتیں بھی عبادت بن جائیں گی۔ اجر و ثواب کا باعث بن جائیں گی۔ ایک اور حدیث جس کے راوی حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ ہیں اُس میں فرمایا:

((سَمِعْتُ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ يَقُولُ قَالَ اللّٰهُ تَبَارَكَ وَتَعَالَى وَجَبَتْ مَحَبَّتِي لِلْمُتَحَابِّينَ فِيَّ وَالْمُتَجَالِسِينَ فِيَّ وَالْمُتَزَاوِرِينَ فِيَّ

وَالْمُتَبَاذِلِينَ فِيَّ))[1]

"اللہ تعالیٰ فرماتا ہے میری محبت واجب ہے اُن لوگوں کے لیے جو باہم میری وجہ سے محبت کریں اور میری وجہ اور میرے تعلق سے کہیں جُڑ کر بیٹھیں اور میری وجہ سے باہم ملاقات کریں اور میری وجہ سے ایک دوسرے پر خرچ کریں۔"

جو شخص اپنی محبتوں میں اس عنصر کو شامل کرے گا اُس کے لیے اللہ کی محبت واجب ہو جائے گی، تو تمام محبتوں کو اللہ کی محبت کے تابع کر دیں۔ اللہ کی خاطر، دوسروں سے محبت کریں، تو اس کا اتنا بڑا اجر ہے۔ ایک اور صحیح مسلم کی روایت میں حضرت ابوہریرہ ﷛ روایت فرماتے ہیں، "ایک شخص اپنے ایک بھائی سے جو ایک دوسری بستی میں رہتا تھا ملاقات کے لیے چلا۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی گزر گاہ پر ایک فرشتے کو بٹھا دیا۔ جب وہ اُس مقام سے گزرا تو فرشتے نے اُس سے پوچھا تمہارا کہاں کا ارادہ ہے۔ اُس نے کہا میں اِس بستی میں رہنے والے اپنے ایک بھائی سے ملنے جا رہا ہوں۔ فرشتے نے دریافت کیا، کیا اُس پر تمہارا کوئی حق احسان ہے یا کوئی عہد ہے جس کو پختہ کرنے جا رہے ہو۔ اُس بندے نے کہا نہیں! میرے جانے کا باعث اِس کے سوا کچھ نہیں کہ اُس بھائی سے اللہ کے لیے محبت ہے۔ پھر فرشتے نے اُس شخص سے کہا کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے تمہارے پاس یہ بتانے کے لیے بھیجا ہے کہ اللہ تعالیٰ بھی تم سے محبت کرتا ہے جیسے تم اللہ کے لیے اُس بندے سے محبت کرتے ہو۔"

اللہ کی محبت میں دوسروں کا خیال کرنا کہ وہ اُس اللہ کے بندے ہیں جس سے ہمیں محبت ہے۔ یہ خیال اور احساس ہمیں دوسروں سے توقعات رکھنے سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ آپ کیوں کسی سے تعلق قائم کرتے ہیں؟ آپ کیوں کسی سے محبت کرتے ہیں؟ اللہ کی خاطر نا! تو جب اللہ کی خاطر ہم کسی سے محبت کرتے ہیں پھر ہمیں توقعات بھی اللہ ہی سے لگانی چاہئیں کہ اللہ ہی اس کا صلہ اور اجر دے گا۔ ورنہ ہم لوگوں سے لوگوں کی خاطر محبت کریں گے تو عام طور پر محبت سے بندھی ہوئی توقعات پوری نہ ہو سکیں گی اور جی میں گِلے شکوے پیدا ہوں گے۔ لہٰذا انسان کو چاہیے کہ محض خدا کے لیے خلقِ خدا سے محبت کرے۔

ایک اور حدیث آتی ہے ابوداؤد میں حضرت عمر فاروق ﷛ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((عَنْ عُمَرَ بْنَ الْخَطَّابِ ﷛ قَالَ قَالَ النَّبِيُّ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اِنَّ مِنْ عِبَادِ اللهِ

---

(۱) موطأ امام مالک، کتاب الجامع، باب ماجاء فی المتحابین فی اللہ

لَأُنَاسًا مَا هُمْ بِأَنْبِيَاءَ وَلَا شُهَدَاءَ يَغْبِطُهُمُ الْأَنْبِيَاءُ وَالشُّهَدَاءُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِمَكَانِهِمْ مِنَ اللهِ تَعَالَى قَالُوا يَا رَسُولَ اللهِ تُخْبِرُنَا مَنْ هُمْ قَالَ هُمْ قَوْمٌ تَحَابُّوا بِرُوحِ اللهِ عَلَى غَيْرِ أَرْحَامٍ بَيْنَهُمْ وَلَا أَمْوَالٍ يَتَعَاطَوْنَهَا فَوَاللهِ إِنَّ وُجُوهَهُمْ لَنُورٌ وَإِنَّهُمْ عَلَى نُورٍ لَا يَخَافُونَ إِذَا خَافَ النَّاسُ وَلَا يَحْزَنُونَ إِذَا حَزِنَ النَّاسُ وَقَرَأَ هَذِهِ الْآيَةَ {أَلَا إِنَّ أَوْلِيَاءَ اللهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ}))[1]

''اللہ کے بندوں میں کچھ ایسے خوش نصیب بھی ہیں جو نبی یا شہید تو نہیں ہیں لیکن قیامت کے دن بہت سے انبیاء اور شہدا، اُن کے خاص مقامِ قُرب کی وجہ سے اُن پر رشک کریں گے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم نے عرض کیا یا رسول اللہ ﷺ ہمیں بتلا دیجیے وہ کون بندے ہیں؟ آپ ﷺ نے فرمایا وہ ایسے بندے ہیں جنہوں نے بغیر کسی رشتے اور قرابت، یا مالی لین دین کے، محض اللہ کے لیے باہم محبت کی۔ بس قسم ہے اللہ کی! قیامت کے دِن اُن کے چہرے نورانی ہوں گے، بلکہ سراپا نور ہوں گے اور وہ نور کے منبروں پر ہوں گے اور عام انسانوں کو جس وقت خوف وہراس ہوگا اُس وقت وہ بے خوف اور مطمئن ہوں گے۔ اور جس وقت عام انسان مبتلائے غم ہوں گے، وہ اُس وقت بے غم ہوں گے۔ اس کے بعد آپ ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی۔ ''معلوم ہونا چاہیے، جو اللہ کے دوست اور اُس سے خاص تعلق رکھنے والے ہیں، اُن کو خوف اور غم نہ ہوگا۔''

ایک اور حدیث رسول ﷺ میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، نبی اکرم ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((إِنَّ اللهَ يَقُولُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَيْنَ الْمُتَحَابُّونَ بِجَلَالِي الْيَوْمَ أُظِلُّهُمْ فِي ظِلِّي يَوْمَ لَا ظِلَّ إِلَّا ظِلِّي))[2]

''اللہ تعالیٰ قیامت کے دن فرمائے گا، کہاں ہیں میرے جلال کی خاطر محبت کرنے والے، آج میں اُن کو اپنے عرش کے سائے میں جگہ دوں گا، جب کہ آج میرے عرش کے سائے کے سوا کوئی سایہ نہیں۔''

دل میں اللہ کی محبت پیدا کرنے کے لیے مشق کی ضرورت ہے:

اللہ کی محبت اپنے دلوں میں کیسے پیدا کی جائے؟ اس بارے میں علماء کہتے ہیں اِس کے لیے

---

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب البیوع، باب فی الرھن

(۲) صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ والآداب، باب فی فضل الحب فی اللہ

مشق کرنی پڑتی ہے۔ اتنی قیمتی اور اعلیٰ چیز بیٹھے بٹھائے حاصل نہیں ہوتی۔ کتاب ''اصلاحی خطابات'' کی جلد نمبر ۹ میں حضرت مفتی محمد تقی عثمانی صاحب فرماتے ہیں کہ:

''اب اگر دنیاوی محبتیں بھی اللہ کے لیے ہو جائیں، تو یہ درجہ حاصل کرنے کے لیے انسان کو مشق کرنی ہوتی ہے۔'' بزرگانِ دین اور صوفیائے کرام کے پاس جب کوئی شخص اپنی اصلاح کی غرض سے جاتا ہے تو یہ حضرات اس طرح تربیت کرتے ہیں یہ ساری مباح محبتیں باقی رہیں، اسلام محبتوں کو مٹانے کے لیے نہیں آیا! اللہ سے شدید محبت کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ باقی کسی سے محبت ہی نہ رہے، بلکہ اسلام یہ چاہتا ہے کہ تمام دنیاوی محبتوں کا زاویہ (angle) بدل جائے۔ نکتۂ نظر تبدیل (change) ہو جائے، اور یہ تمام محبتیں حقیقتاً اللہ کے لیے ہو جائیں۔

ڈاکٹر عبدالحئی رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ میں نے اِن محبتوں کو بدلنے کے لیے سالہا سال تک مشق کی ہے، تب کہیں جا کر کامیابی ہوئی۔ اور مشق اس طرح کی، مثلاً گھر میں داخل ہوئے، کھانے کا وقت ہے، شدید بھوک لگی ہوئی ہے، کھانا سامنے لگا ہوا ہے، اور دِل چاہ رہا ہے کہ جلدی سے کھانا شروع کر دیں لیکن شروع کرنے سے پہلے ایک لمحے کے لیے نفس کو روکا اور دِل میں خیال لایا کہ نفس کے تقاضے کے لیے نہیں کھاؤں گا، ہاتھ روک لیا اور پھر سوچا کہ اللہ تعالیٰ نے میرے نفس کا مجھ پر حق رکھا ہے اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت یہ تھی کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے جب کھانا آتا تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم شکر ادا کرتے ہوئے اپنی احتیاج کے مطابق کھا لیا کرتے۔ مجھے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اِس سنت کی اتباع کرنی چاہیے لہٰذا آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں کھانا کھاتا ہوں۔ پھر کھانا شروع کیا تو اللہ کی خاطر اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے طریقے پر کھایا۔

دیکھیے! اپنے نفس کی تربیت کے لیے مجاہدہ چاہیے۔ ابھی تو حال یہ ہے کہ کھانا کھانے بیٹھتے ہیں تو ہمیں بسم اللہ پڑھنا بھی یاد نہیں رہتا۔ جو اللہ نے خاص مہربانی سے مجھے رزق عطا کیا ہے۔ کتنے ہی لوگ اس نعمت سے محروم ہوں گے، اُن کے پاس کھانے کو کچھ بھی نہ ہوگا۔ اس لیے اللہ کی نعمت کا شکر ادا کرتے ہوئے اُس کے نام سے کھانا شروع کریں۔

دنیا میں انسان کسی سے بھی محبت کرے تو ضروری تو نہیں کہ اس کا جواب محبت ہی کی صورت میں ملے۔ یک طرفہ محبت (One sided love) بہت تکلیف دہ ہوتی ہے۔ لیکن یقین رکھیں کہ جو اللہ سے محبت کرتا ہے اللہ اس محبت کے بدلے ہزار گنا بڑھ کر محبت کرتا ہے۔ اور یہ اللہ کا وعدہ ہے۔ {وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللّٰهِ حَدِيْثًا} (النساء:۸۷)

آپ یہ محبت نہ تول سکتے ہیں نہ ناپ سکتے ہیں اور انتہا یہ کہ اس کا ہم تصور بھی نہیں کر سکتے۔ اللہ سے ہم جتنی چاہیں محبت کر لیں کبھی مضر نہیں ہوگی، کبھی گھاٹا یا نقصان نہیں ہوگا۔ فائدہ ہی فائدہ ہے۔ وارے نیارے ہو جائیں گے۔ اس لیے کثرت سے دعا کرنی چاہیے۔

((اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَسْئَلُکَ حُبَّکَ وَحُبَّ مَنْ یُّحِبُّکَ وَالْعَمَلَ الَّذِیْ یُبَلِّغُنِیْ حُبَّکَ))(۱)

''اے اللہ! میں سوال کرتا ہوں تجھ سے تیری محبت کا، اور اس شخص کی محبت کا جو تجھ سے محبت کرے۔ اور اُس عمل کا جو مجھ کو تیری محبت تک پہنچا دے۔''

رسول ﷺ سے محبت:

دوسری واجب محبت اللہ کے رسول نبی اکرم ﷺ کی محبت ہے۔ اللہ کے بارے میں بھی محبت کا خیال کم ہی لوگوں کو آتا ہے۔ ہم جذباتی تعلق نہیں رکھتے اللہ سے۔ بڑا official، بڑا formal، بڑا distant، بڑا ٹھنڈا ٹھنڈا سا تعلق ہے ہمارا اپنے رب سے۔ جو ہمیں 70 ماؤں سے بھی زیادہ چاہتا ہے، ہماری محبت میں حرارت نہیں ہے، اللہ سے تعلق میں جذبات کی گرمی ہونی چاہیے۔ بے ساختہ پن ہو۔ اللہ کا نام سن کر دل میں ہلچل ہونی چاہیے۔ نبی اکرم حضرت محمد ﷺ کا نام سن کر دل میں کچھ کیفیت ہونی چاہیے۔ آنکھوں میں نمی کا احساس ہو۔ دل ہمارا untouched، لاتعلق نہ رہے۔ اپنائیت اور قربت کا احساس ہو۔ جب تک جذبات شامل نہیں ہوں گے، ایمان نہیں آ سکتا۔ خوشی ہو اللہ کا ذکر سن کر۔ رونا آئے اللہ کا ذکر سن کر۔ محبت اُبلی پڑ رہی ہو۔ اور انسان کو جتنی زیادہ محبت ہوتی ہے کسی سے، اُس کا اتنا ہی زیادہ ذکر کرنا اور سننا چاہتا ہے نبی اکرم حضرت محمد ﷺ سے بھی اتنی ہی اور ایسی ہی محبت ہونی چاہیے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے:

{قُلْ اِنْ کُنْتُمْ تُحِبُّوْنَ اللّٰہَ فَاتَّبِعُوْنِیْ یُحْبِبْکُمُ اللّٰہُ} (آل عمران: ۳۱)

''اے نبی ﷺ! ان سے کہہ دیجیے! اگر تم اللہ سے محبت کرتے ہو تو تم میری پیروی کرو، اللہ تم سے محبت کرے گا۔''

نبی اکرم ﷺ سے ہماری محبت کس نوعیت کی ہونی چاہیے؟ اس بات کا پتا تب ہی چلے گا جب ہم اُن کو جانیں گے، اُن کی سیرت پڑھیں گے، اُن تمام حالات و واقعات سے گزریں گے جو انہیں

---

(۱) جامع الترمذی، کتاب الدعوات، باب ما جاء فی عقد التسبیح بالید

پیش آئے، اُن کی پیدائش سے لے کر اُن کے وصال تک تمام حالات سے باخبر ہوں گے۔ تبھی تو نبی اکرم ﷺ سے محبت کے تقاضے سمجھ آئیں گے۔ جب نبی اکرم ﷺ سے محبت واجب ہے تو آپ کو جاننا بھی واجب ٹھہرا۔ تاکہ آپ ﷺ کی ذات سے کامل محبت اور ایک قدرتی تعلق پیدا ہو۔ کسی بھی انسان سے محبت اس کی معرفت کا نتیجہ ہوتی ہے، کسی کے جمال کی وجہ سے، کمال کی وجہ سے یا جلال کی وجہ سے ہمیں اس سے محبت ہو جاتی ہے۔ جہاں تک اللہ کا تعلق ہے تو ہر صفت کا کامل اظہار اللہ کی ذات میں موجود ہے۔ اگر ان صفات کا ادنیٰ سا پرتو بھی کسی میں دِکھ جائے تو لوگ اس شخص کے گرویدہ ہو جاتے ہیں۔ ذرا سوچیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام اتنے حسین تھے تو اُن کا بنانے والا کتنا خوب صورت ہوگا۔ اس طرح اللہ کے دیدار کی تمنا پیدا ہوتی ہے اور انسان دعا کرتا ہے کہ اے اللہ! مجھے اپنا دیدار نصیب فرما۔ ہم جنت میں تیرے دیدار سے محروم نہ رہ جائیں۔ یہ تڑپ محبت کی وجہ سے پیدا ہوتی ہے۔ اور پھر نبی اکرم ﷺ سے محبت بھی ٹوٹ کر ہونی چاہیے، کیوں کہ خالق کو بھی اپنی تمام تر مخلوقات میں سب سے زیادہ محبت اپنے رسول سے ہے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ''تم میں سے کوئی مومن نہیں ہوسکتا۔ یہاں تک کہ میں اُس کو اُس کے والدین سے، اُس کی اولاد سے اور تمام کے تمام انسانوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔''

یہ آپ ﷺ سے محبت کا معیار ہے۔ اس حدیث کے ضمن میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ آتا ہے کہ آپ رضی اللہ عنہ نے یہ ارشاد سن کر فرمایا کہ: ''آپ ﷺ مجھے دنیا کے تمام رشتوں سے زیادہ پیارے ہیں۔ والدین سے، اولاد سے لیکن اپنے نفس، اپنی جان سے زیادہ پیارے ہیں یا نہیں! یہ میں نے کبھی سوچا نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ جھوٹ تو نہیں بول سکتے تھے۔ انھوں نے کھلے دل سے سچائی کا اعتراف کیا۔ ہمارے اسلاف زبانی کلامی لوگ نہیں تھے، وہ لوگ جو بولتے پوری ذمہ داری کے ساتھ سوچ سمجھ کر بولتے۔'' تو آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا: ''اے عمر رضی اللہ عنہ! تمہارا ایمان ابھی مکمل نہیں۔'' تھوڑی دیر سوچنے کے بعد حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا: ''ہاں رسول اللہ ﷺ!! آپ ﷺ مجھے میری جان سے بھی زیادہ پیارے ہیں۔''

ایسی محبت ہمیں اپنے رب سے اور اُس کے رسول ﷺ سے ہونی چاہیے۔ حدیث میں آتا ہے۔

((اَلْمَرْءُ مَعَ مَنْ أَحَبَّ))[1]

---

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب السنة، باب الدلیل علی زیادة الایمان و نقصانه

''ہر شخص اُس کے ساتھ ہوگا، جس سے اُس نے محبت کی ہوگی۔''

ہوسکتا ہے ہمارے اعمال اس لائق نہ ہوں کہ ہم نبی اکرم ﷺ کے ساتھ آخرت میں رہیں، لیکن اُن سے محبت ہمیں وہاں پہنچا دے گی۔ نبی اکرم ﷺ جب تک ہمارے لیے اجنبی رہیں گے ان سے محبت کا بیج نہیں لگ سکے گا۔ اجنبیوں سے محبت تو نہیں ہوا کرتی۔ محبت کے لیے جاننا ضروری ہے، تبھی اپنائیت پیدا ہوتی ہے اور پھر قربت بڑھتی ہے، پھر کہیں محبت پیدا ہوتی ہے۔ ذرا سوچیں نہ کبھی آپ ﷺ کے زندگی کے حالات پڑھے، نہ آپ کے دن و رات کے معمولات کو جانا، نہ آپ ﷺ کی سیرت اور احادیث کا مطالعہ کیا تو پھر کیسے آپ ﷺ سے محبت کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ صرف زبانی کلامی دعویٰ مناسب نہیں۔ خلاصہ یہ کہ نبی اکرم ﷺ سے محبت جنت پانے کا ذریعہ ہے۔

اسی طرح اللہ سے محبت کی ایک بہت بڑی مثال دیکھیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے اللہ سے دعا کی تھی کہ:

رَبِّ السِّجْنُ أَحَبُّ إِلَيَّ مِمَّا يَدْعُونَنِي إِلَيْهِ (یوسف: ۳۳)

''اے میرے رب! مجھ کو تو قید زیادہ پسند ہے بہ نسبت اُس چیز کے جس کی طرف یہ مجھ کو دعوت دیتی ہیں۔''

یعنی انسان کو اذیت اور سزا قبول ہو جائے لیکن اللہ کی نافرمانی ہرگز قبول نہ ہو۔ کیا یہ محبت کا کوئی معمولی درجہ ہے؟ دراصل انسان کو اللہ سے ایسی ہی محبت ہونی چاہیے کہ ہجومِ بلا اُسے مایوس نہ کر سکے۔

قرآن سے محبت:

پھر واجب محبتوں میں سے ''قرآن کی محبت'' سے بھی دلوں کو آباد کرنا چاہیے۔ کیوں کہ اللہ کا کلام ہے۔ جب اللہ تعالیٰ محبوب ہے تو اُس کا کلام بھی محبوب ہونا چاہیے۔ بڑے شوق اور نہایت دل چسپی سے اِسے پڑھنا چاہیے۔

کعبہ سے محبت:

کعبہ سے محبت بھی ایمان کا تقاضا ہے۔ ذرا سوچیں لوگ کیسے دیوانہ وار کعبہ کے گرد چکر لگاتے ہیں، والہانہ طواف کرتے ہیں۔ اہل ایمان کے دل میں کتنی خواہش و تمنا ہوتی ہے زندگی میں کم از کم ایک بار اللہ کے گھر کا دیدار ہو جانے کی۔ یہ اللہ کا بڑا کرم ہے کہ یہ شوق مسلمانوں میں زندہ ہے،

برقرار ہے۔ ہر عمر، ہر ملک، ہر زبان اور رنگ و نسل کے مسلمان ہر سال بغیر کسی جبر کے حج پر جاتے ہیں۔ اللہ کے گھر کا طواف کرتے ہیں اور نبی اکرم ﷺ کے روضۂ مبارک کا دیدار کرتے ہیں۔

نیک لوگوں سے محبت:

نیک لوگوں سے بھی محبت ہونی چاہیے، اُن کے ساتھ اُن کی صحبت میں رہنے کی خواہش اور محبت ہونی چاہیے۔ اس کی دعائیں تو پیغمبروں نے بھی کی ہیں۔ مثلاً حضرت یوسف علیہ السلام کی دعا قرآن حکیم میں بیان ہوئی:

{وَّاَلْحِقْنِیْ بِالصّٰلِحِیْنَ} (یوسف: ۱۰۱)

''اللہ مجھ کو صالحین کے ساتھ ملا دے۔''

اسی لیے نیک لوگوں کی زندگی کا مطالعہ بھی کرنا چاہیے تاکہ سلف صالحین کی صحبت کی صورت پیدا ہو جائے۔

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور آلِ محمد ﷺ سے محبت:

ہم حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ، عمر رضی اللہ عنہ، عثمان رضی اللہ عنہ، علی رضی اللہ عنہ اور دیگر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا روایات میں ذکر پڑھتے ہیں تو دل میں محبت پیدا ہوتی ہے۔ سورۃ الاحزاب میں ازواج مطہرات کا ذکر پڑھتے ہیں اور خاص طور پر واقعۂ افک میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا صبر پڑھ کر کتنا دل چاہتا ہے کہ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو چشم تصور سے دیکھا جائے کہ آپ کیسی ہوں گی، اُن کی شخصیت کتنی خوب صورت تھی۔ نبی اکرم ﷺ کو کتنی محبوب تھیں۔ پھر حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بارے میں انسان سوچتا ہے تو اُن کے حالات کے مطابق ایک نقشہ کھنچتا چلا جاتا ہے۔ خوب صورت اور معصوم چہرۂ مبارک، چکّی پیستی ہوئی، حضرت حسن رضی اللہ عنہ اور حسین رضی اللہ عنہ گود میں، باپ سے شدید محبت کرنے والی بیٹی۔ نہ ہم نے ان کو دیکھا، نہ اُن سے ملے۔ پھر بھی ہمارے دلوں میں اُن کی کشش موجود ہے۔ یہ بھی مبارک محبت ہے۔ اللہ اس کو قائم رکھے اور مزید بڑھائے۔

دین کے مددگاروں سے محبت:

ہمیں دین کے مددگاروں سے بھی محبت ہونی چاہیے۔ اُن کی چھوٹی موٹی کمزوریوں کو درگزر کریں، اُن کی باتوں کا بُرا نہ مانیں، اُن کے عیب نہ ٹٹولیں، اُن کی عزت و احترام کریں، اُن کی مدد کریں اور اُس مقصد سے بھی محبت کریں۔ اگر اللہ سے محبت ہوگی تو پھر اُس کے لیے جینے والے ہر

شخص سے محبت ہوگی، اس کے راستے کے ہر مسافر کی دل میں قدر ہوگی۔

اللہ سے سچی محبت کی نشانی:

اللہ کی محبت کی علامت اور نشانی کیا ہے؟ اُس کی علامت یہ ہے کہ اگر کسی وقت اللہ کی محبت کا یہ تقاضا ہو کہ میں دنیاوی محبتوں کو خیر باد کہہ دوں، جن چیزوں سے مجھے محبت ہے میں اُن میں سے کسی بھی محبت کو چھوڑ دوں، تو میں فوراً اُس کو چھوڑ دوں۔ اُس وقت انسان کی طبیعت پر نا قابل برداشت بوجھ نہ ہو۔ ظاہر ہے جس چیز سے محبت ہوتی ہے اُس کو چھوڑنا تو مشکل ہوتا ہی ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کتنی ہی محبتیں اللہ کی راہ میں قربان کیں۔ اگر یہ انسان کا رویہ اللہ کے حکم پر فوراً عمل، فرماں برداری، سرِ تسلیم خم کرنے کا ہو جائے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ تمام محبتیں اللہ کی محبت کے تابع ہیں۔ اُس کی کمزوری نہیں رہیں، مجبوری نہیں رہیں، اللہ کے احکام ماننے میں رکاوٹ نہیں رہیں۔ انسان اور اللہ کے درمیان یہ رکاوٹ (barrier) نہیں بنیں بلکہ قربت کا ذریعہ بنی ہیں۔ یہ نہ ہو کہ ان محبتوں کے دام میں گرفتار ہو کر اللہ کو بھول جائیں یا پسِ پشت ڈال دیں۔

مباح محبتیں:

مباح محبتیں (permissible affections) کون سی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ آل عمران میں فرمایا:

{ زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوَاتِ مِنَ النِّسَاءِ وَالْبَنِينَ وَالْقَنَاطِيرِ الْمُقَنطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ}(۱۴)

"مزین کر دی گئی ہے لوگوں کے لیے خواہشات کی محبت (یعنی انسان فطری طور پر محبت کرتے ہیں) بیویوں سے، بیٹوں سے (مراد ہے بچوں سے) اور ڈھیروں ڈھیر مال سے، سونے چاندی کے خزانوں سے اور نشان زدہ گھوڑوں سے۔"

یہ عام مشاہدہ ہے کہ انسان کو اہل و عیال اچھے لگتے ہیں، مال مویشی دل کو لبھاتے ہیں، جائیداد اطمینان کا باعث بنتی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ سب محبتیں دل کے اندر پیوست کر دی ہیں۔ فرمایا:

{هَذِهِ الْحَيَاةُ الدُّنْيَا مَتَاعٌ}(المؤمن: ۳۹)

"یہ سب کچھ تو دنیا کی زندگی کا سامان ہے"

تو ان چیزوں سے محبت کرنے کو منع نہیں کیا گیا۔ یہ محبتیں حرام کے زمرے (category)

میں نہیں آتیں، یہ مباح ہیں۔ ان سے محبت کرنے کی اجازت ہے۔ اسی طرح دنیا کو بُرا بھلا نہیں کہنا چاہیے کیوں کہ یہ دنیا اللہ نے بنائی ہے۔

مباح محبتوں کی اہمیت:

دیکھا جائے تو ان مباح محبتوں کی وجہ ہی سے دنیا کی رونق چل رہی ہے، ورنہ اگر دولت میں کشش نہ ہوتی، اولاد کی خواہش دل میں نہ ہوتی اور شادی بیاہ کا ارمان اور ضرورت نہ ہوتی تو کوئی کیوں محبت کرتا، مشقتیں جھیلتا، دوڑ دھوپ کرتا۔ یہ ساری رونقیں (hustle bustle) انہی کی وجہ سے ہیں۔ دوسرے انہی نعمتوں کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ نے جنت کی پہچان بھی کرائی ہے۔ قرآن میں جب جنت کا ذکر آتا ہے تو وہاں کے محلات کا، پاکیزہ جوڑوں کا، زیورات کا اور خوب صورت لباس کا بھی ذکر آتا ہے۔ جنت کی ان نعمتوں کی پہچان کی غرض سے ان کی جھلک دنیا ہی میں دکھادی گئی۔ تاکہ جنت کو متصور کر کے زندگی کا مقصد اسی کے حصول کو بنائیں۔

اللہ تعالیٰ کا یہ احسان ہے کہ اس نے ان مباح محبتوں کو نبھانے پر جنت کا وعدہ کیا ہے۔ یعنی اگر ہم والدین کے حقوق احسن طریقے سے ادا کریں تو جنت کے حق دار بن جائیں گے۔ اس کے علاوہ اللہ تعالیٰ نے رشتہ داروں اور قرابت داروں کے حقوق رکھے ہیں۔ ایک انسان ان کے حقوق ادا کر کے جنت تک پہنچ سکتا ہے۔ اور سب سے بڑا حق تو یہ ہے کہ یہ تمام مباح چیزیں جو ہیں، اُن کو اللہ سے جوڑ دیا جائے۔ اللہ سے ان کا (connection) کر دیا جائے۔ پھر یہ تمام "مباح محبتیں" واجب محبتوں تک پہنچنے میں بھی مددگار ثابت ہوتی ہیں۔ ایک سیڑھی اور ایک ذریعہ بن جاتی ہیں، اللہ کی محبت کو حاصل کرنے کا۔ یہ ساری محبتیں ایک طرح سے آخرت میں، جنت کو پانے کی (currency) ہیں۔ یہ تمام حق ادا کرو، جنت پالو گے۔ اور یہی محبتیں امتحان بھی ہیں۔ کہیں ان کے اندر ہم الجھ کر نہ رہ جائیں۔ اگر دولت کی محبت دل میں نہ ہوتی زکوٰۃ دینے کا کیا اجر ہوتا۔ اگر کھانے پینے کی محبت دل میں نہ ہوتی، تو روزہ رکھنے کا کیا اجر ہوتا۔ اللہ کا فرمان ہے

{لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّوْنَ} (آل عمران: ۹۲)

"تم ہرگز نہیں پہنچ سکتے نیکی تک، جب تک تم اُن چیزوں کو اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرو جن سے تم محبت کرتے ہو۔"

یہ نعمتیں اور ان سے محبت فطری طور پر ہمارا امتحان بھی ہے۔ انہی نعمتوں کے ذریعے سے ہم

آزمائے بھی جائیں گے، اور اجر کے مستحق ہوں گے اگر ہم ان پسندیدہ چیزوں کو فطری محبت کے باوجود، اللہ کی راہ میں، اللہ کی مرضی کے مطابق خرچ کرتے ہیں۔ ان کے اندر الجھ کر نہ رہ جائیں۔ ان کو زندگی کا مقصد نہ بنالیں، دینے والے کو بھول جائیں اور اُس کی دی ہوئی نعمتوں ہی کی پرستش کرنے لگیں۔

مباح محبتوں کی حدود:

اللہ تعالیٰ نے یہ تمام زینتیں دنیا میں رکھی ہیں تاکہ ہمیں آزمائے کہ ہم جنت کے خریدار بنتے ہیں یا اسی دنیا میں گم ہوجاتے ہیں جو بالآخر ختم ہوجانے والی ہے۔ اسلام میں ''انسان دوستی'' تو یقیناً بہت پسندیدہ ہے لیکن ''انسان پرستی'' کی بالکل گنجائش نہیں ہے کہ انسانوں سے اتنی محبت ہوجائے کہ حبّ اللہ کے تقاضے نظر انداز ہونے لگیں۔ یہ مباح محبتیں اُس وقت تک جائز ہیں جب تک یہ واجب محبتوں کے تابع رہیں، اپنی حدود (limits) کے اندر اندر رہیں۔ اگر ان مباح محبتوں کا مقام ہماری زندگی میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ، اور اللہ کی کتاب سے سب سے بڑھ جاتا ہے تو یہ حد سے بڑھ جانا ان جائز محبتوں کو بھی ناجائز بنادیتا ہے۔ کیوں کہ ایک مباح چیز کا حد سے بڑھ جانا اس کو پسندیدہ کی بجائے مکروہ بنادیتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے سورۃ التوبہ آیت نمبر ۲۴ میں فرمایا ہے:

{ قُلْ اِنْ كَانَ اٰبَآؤُكُمْ وَاَبْنَآؤُكُمْ وَاِخْوَانُكُمْ وَاَزْوَاجُكُمْ وَعَشِيْرَتُكُمْ وَاَمْوَالُ ِۨاقْتَرَفْتُمُوْهَا وَتِجَارَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ اَحَبَّ اِلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَجِهَادٍ فِيْ سَبِيْلِهٖ فَتَرَبَّصُوْا حَتّٰى يَاْتِيَ اللّٰهُ بِاَمْرِهٖ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ }

''اے نبی ﷺ ان سے کہہ دیجیے اگر تمہیں تمہارے باپ دادا اور تمہاری اولاد، اور تمہارے بہن بھائی، اور تمہارے جوڑے (میاں بیوی) اور تمہارا کنبہ، اور تمہارے وہ مال جو تم نے کمائے ہیں، اور وہ تجارت تمہاری جس کے نقصان کا تم کو اندیشہ لگا رہتا ہے، اور تمہارے وہ گھر جو تمہیں بہت اچھے لگتے ہیں۔ اگر یہ چیزیں تمھیں زیادہ محبوب ہیں اللہ سے اور اُس کے رسول ﷺ سے اور اللہ کی راہ میں جہاد کرنے سے تو پھر انتظار کرو، یہاں تک کہ اللہ اپنا فیصلہ لے آئے اور اللہ ایسے فاسقوں کو ہدایت نہیں دیتا۔''

اس آیت میں ان لوگوں کو فاسق کہا گیا جو مباح محبتوں کے دام ہی میں گرفتار ہوجاتے ہیں۔ یہی ہماری سب سے بڑی آزمائش ہے۔ اس آیت میں ایک ترازو ہے جس کے ایک پلڑے میں ان آٹھ محبتوں کو ڈالیں اور دوسرے پلڑے میں اللہ، اللہ کے رسول ﷺ اور جہاد کی محبت ڈالیں اور خود دیکھ لیں کون سا پلڑا بھاری ہے۔ خود ہی اندازہ ہوجائے گا ہم آخرت میں کہاں کھڑے ہوں گے اور کس سلوک کے مستحق ہوں گے۔ یہ تو پھر بھی آٹھ (۸) محبتوں کا بیان ہے۔ ہمارا حال تو یہ ہے کہ ایک ہی محبت میں پھنس کر اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو بھول جاتے ہیں، ایک ہی نعمت کو پاکر غافل ہوجاتے ہیں اور دیوانہ وار اُس کو پوجنے لگتے ہیں۔

ان محبتوں پر قابو (control) پانے کی ضرورت ہے۔ اور یہی بہت بڑا جہاد ہے کہ ہم مباح محبت کو ناجائز ہونے سے بچالیں۔ اچھی خاصی جائز چیز سے محروم نہ ہوجائیں۔ مثال کے طور پر ایک شخص خوب محنت مشقت کرکے حلال روزی کماتا ہے لیکن اگر وہ اس حلال کمائی کو کسی ناجائز چیز پر خرچ کردے تو اُس نے اپنا کتنا نقصان کیا۔ حلال چیز کے غلط استعمال نے ایک اچھی چیز کو برا بنادیا۔ حلال چیزیں اچھی ہیں، ہماری زندگی کی رونقیں ہیں۔ یہ ساری محبتیں، والدین کی، اولاد کی، رشتہ داروں کی، مال کی، گھر کی متاع دنیا ہے۔ لیکن ان میں حد سے زیادہ ملوث ہوجانا اور ان محبتوں کی خاطر اللہ اور رسول اللہ ﷺ کی محبت کو قربان کردینا سراسر گھاٹے کا سودا ہے۔ انسانوں کا اپنی محبتوں کو جائز حد کے اندر رکھنا بہت بڑا جہاد ہے، اس کے لیے سالہا سال کی محنت چاہیے۔ اس کو منضبط کرنے کا طریقہ وہی ہے جو ڈاکٹر عبدالحی رحمہ اللہ نے بتایا ہے کہ بندہ جو بھی کام کرے وہ شعوری طور پر سوچ کر کرے کہ میں یہ کام اللہ کی رضا کے لیے کررہی ہوں یا کررہا ہوں اور یہ ایک طویل جہاد ہے جس کے لیے طویل مدت چاہیے۔ جب انسان ان مباح محبتوں کو اللہ کی محبت کے تابع کردیتا ہے تب یہ محبتیں اُس کی طاقت بن جاتی ہیں، کمزوری نہیں بنتیں، اُس کے پاؤں کی بیڑیاں نہیں بنتیں، اُس کو مزید جلا (empower) بخشتی ہیں۔ جو اللہ کی خاطر ان چیزوں سے محبت کرتا ہے وہ ہمیشہ دینے والا ہوتا ہے، لینے والا نہیں ہوتا۔ وہ لوگوں سے توقعات نہیں رکھتا، اُس کی شخصیت بہت مضبوط رہتی ہے۔ ایسے شخص کو دنیا کی مباح محبتیں کبھی دکھ نہیں پہنچائیں گی، اذیت کا سبب نہیں بنیں گی، کبھی رنج نہیں پہنچائیں گی۔ اُس کی زندگی کو خوش نما (positive out look) بنائیں گی۔ اُس کی زندگی میں سکون اور خوشیاں پھیلائیں گی۔

اللہ سے دنیوی خوشیوں کے لیے محبت رکھنا:

اگر کوئی اللہ سے اس لیے محبت کرتا ہے کہ اُس کی دنیا کی خوشیاں برقرار رہیں، مثلاً نماز اس لیے پڑھتا ہے کہ صحت اچھی رہے، زکوٰۃ اس لیے دیتا ہے کہ مال چوری نہ ہو۔ یعنی ہر نیکی اور عبادت کے پیچھے نیت یہ ہو کہ دنیاوی خوشیاں قائم ودائم رہیں، جاری وساری رہیں اور جن دنیاوی نعمتوں سے مجھے محبت ہے ان پر آنچ نہ آئے۔ اللہ سے محض اس لیے دُعا، سوال اور آہ وزاری کہ دنیاوی نعمتیں قائم رہیں، ان کو کچھ نہ ہونے پائے۔ ایسے لوگ ہمیشہ اداس (upset) رہتے ہیں۔ کوئی نقصان ہوجائے، خسارہ ہوجائے اللہ سے بدگمان ہوتے ہیں اور لوگوں کی طرف سے بھی مخدوش (insecure) رہتے ہیں۔

اصل حق اللہ اور اس کے دین کا ہے:

اس معاملے میں بہت محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ ہمارے نفس کا ہم پر حق ہے یہ مضمون تو ہمیں حدیث پاک میں ملتا ہے:

((فَاِنَّ لِجَسَدِکَ عَلَیْکَ حَقًّا وَاِنَّ لِعَیْنِکَ عَلَیْکَ حَقًّا وَاِنَّ لِزَوْرِکَ عَلَیْکَ حَقًّا وَاِنَّ لِزَوْجِکَ عَلَیْکَ حَقًّا))[1]

''تیرے نفس کا بھی تجھ پر حق ہے، تیری بیوی کا بھی تیرے اوپر حق ہے، تیرے مہمان کا بھی تجھ پر حق ہے۔''

لیکن یہ نہ ہو کہ یہ سب حقوق ادا کرتے کرتے اللہ کا حق ادا کرنے کا وقت ہی نہ بچے۔ مال کے لیے روئیں، اولاد کے لیے روئیں، کاروبار وغیرہ کی فکر میں گھلتے رہیں اور کبھی دین کا خیال ہی نہ آئے کہ دین کا بھی ہم پر حق ہے۔ دین کے لیے بھی فکرمند اور پریشان ہونا چاہیے۔ ہمارے مال اور وقت میں، ہماری توجہ اور محبت میں ہمارے دین کا بھی حصہ ہے۔ ہر ایک کی یاد میں رونا آئے اور اللہ کی یاد میں کبھی آنکھ پرنم نہ ہو، یہ نہیں ہونا چاہیے۔

حرام محبت:

چوتھی قسم حرام محبت کی ہے، یعنی ایسی محبت جو گناہ کا باعث بنے یا بذات خود گناہ ہی سے محبت ہوجائے۔ یعنی جن چیزوں کو اللہ تعالیٰ نے حرام قرار دے دیا اُن چیزوں سے محبت، جن چیزوں سے

---

(۱) صحیح البخاری، کتاب الادب، باب حق الضیف

اللہ کے رسول ﷺ نے روکا ہے اُن کی طرف رغبت، یا اُن میں ملوث ہوجانا، یہ بڑا فتنہ ہے۔ ناجائز چیزوں میں کشش محسوس کرنا بھی فتنہ فساد ہے۔ قرآن میں سورۃ آل عمران آیت نمبر ۱۸۸ میں آتا ہے کہ:

''وہ پسند کرتے ہیں کہ اُن کی تعریف کی جائے، ایسے کاموں پر جو اُنہوں نے نہیں کیے''

یہ اپنی تعریف کی خواہش ہے، اپنی شہرت کی تمنا اور اپنی مدح (flattery) سننے کا شوق، قصیدوں کا شوق، دل چاہے کہ لوگ میری تعریف کریں، خوشامد کریں۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں ان چیزوں سے منع فرمایا ہے اور اس کی قرآن میں بہت مذمّت (condemn) کی گئی ہے۔ تو جائز چیزوں پر بھی اپنی تعریف پسندیدہ نہیں۔ رسولوں نے ہمیشہ اپنی قوم سے کہا تھا۔

{مَآ اَسْئَلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ} (الفرقان:۵۷)

''میں اس کام کا تم سے کوئی صلہ کوئی اجر نہیں مانگتا۔''

تعریف کی شکل میں بھی رسولوں نے اپنی قوموں سے اجر نہ مانگا، نہ احسان جتایا۔ وہ اپنے رب سے اجر کے طلب گار ہوتے تھے۔ جائز کاموں پر بھی بہت تعریف چاہنا اور اپنی شہرت کی خواہش دل میں رکھنا انتہائی ناپسندیدہ ہے۔

اسی طرح ایسی چیزوں سے محبت کرنا، جن سے اللہ نے منع کیا، مثال کے طور پر شراب یا زنا یا جُوا۔ یہ سب حرام محبتیں ہیں ان سب سے بچنا چاہیے۔ اپنے آپ کو بھی ان سے دور رکھیں اور اپنے دل کو بھی ان سے بچائیں۔ حرام چیزوں کی محبت دل میں اُس وقت آتی ہے جب اردگرد کے لوگوں میں یہ چیزیں رچی بسی ہوں۔ جب وہ دیکھتا ہے کہ حرام کاریوں میں ملوث ہونے کے باوجود دنیا میں ان کو کوئی نقصان نہیں پہنچ رہا، بلکہ یہ تو بہت مزے (enjoy) کر رہے ہیں، خوش باش ہیں۔ اور شیطان تو گناہوں کو بہت ہی خوب صورت، اور پُرلطف (enjoyable) دکھاتا ہے تو جب وہ دیکھتا ہے کہ گناہ میں اتنی رنگینی اور مزہ ہے اور کوئی سزا بھی نہیں مل رہی تو پھر اس کے دل میں بھی یہ شیطانی خیال آتا ہے کہ پھر میں کیوں محروم رہوں! اور پھر رفتہ رفتہ وہ ان چیزوں کی محبت میں گرفتار ہوجاتا ہے۔

دنیا کی پرکشش چیزیں امتحان کے لیے ہیں:

شیطان کا کام ہی یہ ہے کہ وہ گناہوں کو، حرام کردہ چیزوں کو اچھا اور خوب صورت کر کے

دکھائے۔ اگر یہ گناہ اتنے پرکشش (attractive) نہ ہوتے تو پھر ان سے بچنے کا کیا اجر ہوتا؟ یہ تو پھر امتحان نہ ہوتا۔ یہی تو امتحان ہے کہ چمک دمک کے باوجود ان سے منہ موڑ لیا جائے۔ اسی بات پر اجر وثواب (reward) ہے۔ جو لوگ ان چیزوں کو آرٹ کے ذریعے، اشتہارات کے ذریعے پُرکشش بنا کر دکھاتے ہیں، یا ان کو مال کمانے کا ذریعہ بناتے ہیں اور لوگوں کو گناہوں کی طرف مائل کرتے ہیں وہ اللہ کے ہاں رسوا ہوں گے۔ نقد سزا یہ ہے کہ اللہ کی محبت اور رحم سے محروم ہوں گے، یعنی واجب محبت سے محروم ہو جائیں گے، انتہائی قیمتی (valuable) چیز سے تہی دست ہو جائیں گے۔ اور حقیر وگھٹیا محبتوں پر اکتفا کر لیں گے، جس کا نتیجہ بھی خسارہ ہی نکلے گا۔ خلاصہ یہ کہ نہ ان حرام چیزوں کے قریب جانا چاہیے اور نہ ان کا شوق یا خواہش دل میں آنے دیں۔ ہر طرح ان سے دُور رہیں اور درحقیقت یہ انسان کے لیے بڑی آزمائش ہے کہ اُسے ایسے شخص سے محبت ہو جائے، اُس کا گرویدہ ہو جائے جو اللہ سے محبت نہ کرے۔ یہ بہت بڑی آزمائش ہے۔

اللہ سے محبت کرنے والوں ہی سے محبت رکھنی چاہیے:

سب سے اچھی اور مبارک چیز یہ ہے کہ ہم جن سے محبت کریں وہ خود بھی اللہ سے محبت کرتے ہوں۔ تبھی تو یہ دُعا سکھائی گئی ہے کہ:

((اَللّٰھُمَّ اِنِّی أَسْأَلُکَ حُبَّکَ وَ حُبَّ مَنْ یُحِبُّکَ)) (۱)

''اے اللہ! مجھے اپنی اور اس شخص کی محبت دے جو تجھ سے محبت رکھتا ہے''

اور ایسے لوگوں کی صحبت اختیار کرنی چاہیے، ان سے جڑنا چاہیے۔ فرض کریں آپ کے والدین کو اللہ سے محبت نہ ہو تو یہ کتنی بڑی آزمائش ہے۔ آپ کے شوہر کو، اولاد کو، ان رشتوں کو جن سے ہمیں محبت ہوتی ہے مگر وہ اللہ سے محبت نہ کرتے ہوں یا ہمارے دوست احباب جو ہمیں عزیز ہیں، ہمارے دکھ سکھ میں ہمارا ساتھ دیتے ہیں لیکن وہ اللہ سے دور ہوں تو پھر یہ لوگ آپ کے لیے فتنہ وآزمائش بن جاتے ہیں۔ ایسی صورت حال میں انسان واجب کو سب سے اوپر رکھے اور باقی محبتیں اگر قربان کرنا پڑیں تو قربان کر دے لیکن اللہ کی محبت نہ چھوڑے۔ ایسے لوگوں کی محبت کبھی بھی دل میں پیدا نہ ہو جو اللہ سے جنگ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

{لَا تَجِدُ قَوْمًا یُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ یُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ}

(المجادلہ: ۲۲)

---

(۱) جامع الترمذی، کتاب الدعوات، باب ما جاء فی عقد التسبیح بالید

''تم نہیں پاؤ گے ایک قوم کو جو ایمان رکھتے ہیں اللہ پر اور آخرت پر کہ وہ محبت کرتے ہوں اُن لوگوں سے جو جنگ کر رہے ہوں اللہ اور اس کے رسولؐ سے۔''

ایمان والے بیک وقت اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ سے اور ان کے دشمنوں سے کیسے محبت کر سکتے ہیں۔ اُس تہذیب اور اس کلچر سے کیسے محبت ہو سکتی ہے جو اسلام دشمنی پر مبنی ہو۔ جو قومیں اسلام کو حقارت سے دیکھتی ہیں ان سے دلی تعلق کیسے پیدا ہو سکتا ہے۔ وہ نظام جو خدا دشمنی پر کھڑا ہوا ہے ایک مسلمان کے خوابوں کا محور کیسے ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے دُعا کریں کہ ''اے اللہ ہمیں حرام محبتوں سے بچالے اور واجب محبت کا حق ادا کرنے والا بنادے اور ناجائز اور مکروہ محبتوں کے فتنے سے بچالے۔'' ہم مباح چیزوں کو ناجائز حد تک لے جائیں اور حلال چیزوں کو اپنے لیے باعثِ فتنہ بنالیں۔ احادیث کی کتابوں میں اتنی خوب صورت دُعائیں آئی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کی محبت مانگی گئی ہے۔ ایک دُعا ہے:

((اَللّٰھُمَّ اجْعَلْ حُبَّکَ اَحَبَّ الْاَشْیَاءِ اِلَیَّ وَاجْعَلْ خَشْیَتَکَ اَخْوَفَ الْاَشْیَاءِ عِنْدِی وَاقْطَعْ عَنِّیْ حَاجَاتِ الدُّنْیَا بِالشَّوْقِ اِلٰی لِقَآئِکَ اِذَا اَقْرَرْتَ اَعْیُنَ اَھْلِ الدُّنْیَا مِنْ دُنْیَاھُمْ فَاَقْرِرْ عَیْنِیْ مِنْ عِبَادَتِکَ))(۱)

''اے اللہ اپنی محبت کو میرے نزدیک تمام چیزوں کی محبت سے بڑھا دے۔ اے اللہ تو اپنا خوف میرے نزدیک تمام چیزوں کے خوف سے بڑھا دے۔ اے اللہ تو اپنی ملاقات کے شوق میں دنیا کی حاجات مجھ سے کاٹ دے۔ اے اللہ جب تو دنیا والوں کو، ان کی دنیا سے ٹھنڈک اور لذت دے تو میری آنکھوں کی لذت اور ٹھنڈک اپنی بندگی میں رکھ دے!''

((اَللّٰھُمَّ ارْزُقْنِیْ حُبَّکَ وَحُبَّ مَنْ یَّنْفَعُنِیْ حُبُّہٗ عِنْدَکَ، اَللّٰھُمَّ مَا رَزَقْتَنِیْ مِمَّآ اُحِبُّ فَاجْعَلْہُ قُوَّۃً لِّیْ فِیْمَا تُحِبُّ اَللّٰھُمَّ مَا زَوَیْتَ عَنِّیْ مِمَّآ اُحِبُّ فَاجْعَلْہُ فَرَاغًا لِّیْ فِیْمَا تُحِبُّ))(۲)

''اے اللہ! مجھ کو اپنی محبت عطا کر اور اس شخص کی محبت دے جس کی محبت مجھے تیرے قریب کرنے میں فائدہ دے۔ اے اللہ! جو تو نے مجھے عطا کیا ہے جس سے میں محبت کرتا ہوں تو اس کو میرے ان کاموں کے لیے قوت کا سبب بنادے، جن سے تو محبت رکھتا ہے۔ اے اللہ!

---

(۱) کنز العمال فی سنن الاقوال والافعال، کتاب الدعا، الفصل السادس جوامع الادعیہ
(۲) جامع الترمذی، کتاب الدعوات، باب ماجاء فی عقد التسبیح بالید

جو تو نے مجھ سے لے لیا ہے جس سے میں محبت کرتا ہوں، تو اس کو ان کاموں کے لیے فراغت کا باعث بنا جن سے تو محبت کرتا ہے۔"

دیکھیں یہ کتنی عظیم دعائیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ سے ہمیں یہی دُعائیں اسی طرح مانگنی چاہئیں۔

مختلف محبتوں کی نشان دہی:

ہمیں یہ دیکھنا ہے کون سی محبت واجب ہے، کون سی مباح اور کون سی حرام کے زمرے (category) میں آ رہی ہے۔

دو چیزوں کو تو صرف دیکھنے کا بھی اجر ہے: خانہ کعبہ کو اور والدین کو۔ خانہ کعبہ تو ہمارے گھر میں نہیں ہوتا لیکن والدین تو ہوتے ہیں۔ اُن سے ضرور محبت کریں، والدین کو محبت بھری نظر سے دیکھنا بھی صدقہ ہے۔ حدیث میں مضمون آتا ہے کہ:

"والدین کو محبت کی نگاہ سے، مسکرا کر دیکھنے پر مقبول حج کا ثواب ملتا ہے۔"

کسی نے پوچھا یا رسول اللہ ﷺ اگر ہم والدین کو دن میں سو بار دیکھیں تو کیا سو مقبول حج کا ثواب پائیں گے۔ آپ ﷺ نے فرمایا: "تم عمل کرتے کرتے تھک جاتے ہو، اللہ اجر دیتے دیتے نہیں تھکتا۔"

اس میں احتیاط یہ رکھنی ہے کہ والدین اگر کسی ایسی بات کا حکم دیں جس کا اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا ہے تو اطاعت نہیں کرنی۔ ہاں ان کی عزت و شرف میں کمی نہ آنے پائے لیکن ان کی بات پر عمل کرنا جائز نہیں۔ اگر ہم یہ حدود کھینچ لیں اور ان کا لحاظ کر سکیں تو یہ بڑی بات ہے۔ ہمارا مسئلہ یہ ہے کہ ہم مخالفت اور حمایت دونوں میں حد سے گزر جاتے ہیں۔ اپنی زندگی کو مسلسل توازن میں رکھنا آسان بات نہیں ہے، یہ لمحہ لمحہ جہاد ہے۔ ہم کبھی ادھر ڈھلک جاتے ہیں اور کبھی اُدھر بڑھ جاتے ہیں۔

خاندان کے دباؤ میں آ کر رسمِ مہندی میں جانا، ورنہ بڑی بدمزگی ہوگی۔ یعنی خاندان کی محبت مباح سے بڑھ کر ناجائز میں چلی گئی۔ اس محبت نے اللہ کے رسول ﷺ کی نافرمانی پر آمادہ کر دیا۔ یا پھر رات گئے تک آپ کے بچوں نے پڑھائی کی تو انھیں فجر کی نماز کے لیے نہیں اُٹھایا۔ یعنی مائیں اپنے بچوں سے اتنی محبت نہ کریں کہ انہیں اللہ کا فرمان بردار بنانے سے ہچکچائیں۔ اولاد سے محبت مباح تھی، مگر ہم اُسے حرام کے درجے تک لے گئے۔ امتحان سروں پر ہیں، روزہ کی حالت میں پڑھنا مشکل ہے، اس لیے بچے روزہ نہ رکھیں، یہ محبت بھی حرام کے درجے میں چلی گئی۔ یعنی اللہ

کی نافرمانی کرنا تسلیم کرلیا لیکن اولاد کو تکلیف دینا گوارا نہ ہوا، ان کو بے آرام کرنا ٹھیک نہیں لگا۔ اسی طرح بیٹیاں جب بالغ ہوجائیں تو حجاب فرض ہے لیکن والدین نہیں کرواتے کہ لوگ ہنسیں گے، دوست کیا کہیں گے، اس کی عمر کی اور کوئی لڑکی پردہ نہیں کرتی۔ یا پھر اس ڈر سے کہ رشتے آنے بند ہوجائیں گے اگر ہم نے بیٹیوں کو پردہ کروادیا۔ یعنی اولاد کی محبت اللہ کی محبت سے، اس کے حکم سے آگے بڑھ گئی۔ سورۂ تحریم میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

{يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا قُوا أَنفُسَكُمْ وَأَهْلِيكُمْ نَارًا وَقُودُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ عَلَيْهَا مَلَائِكَةٌ غِلَاظٌ شِدَادٌ لَّا يَعْصُونَ اللَّهَ مَا أَمَرَهُمْ وَيَفْعَلُونَ مَا يُؤْمَرُونَ} (التحریم:٦)

"اے ایمان والو! بچاؤ اپنے آپ کو اور اپنے اہل وعیال کو آگ سے جس کا ایندھن انسان اور پتھر ہوں گے۔ اس جہنم پر ایسے فرشتے ہیں جو انتہائی سخت دل وتند خو ہیں۔ وہ اللہ کے حکم کی نافرمانی نہیں کرتے، وہ تو وہی کرتے ہیں جس کا ان کو حکم دے دیا جائے۔"

کیا ہم اپنی اولاد کو ایسے سخت گیر فرشتوں کے حوالے کرسکیں گے۔ یہ کیسی محبت ہے کہ اپنی اولاد کو جہنم کا نوالہ بنادیا، یہ تو محبت کی صحیح تعبیر نہ ہوئی بلکہ الٹا ظلم اور دشمنی کی اپنی اولاد سے۔ مباح محبتوں کا حق اس وقت ادا ہوسکتا ہے، جب اس کو اللہ کی محبت کے تابع رکھا جائے اور جب ان کو اللہ کی محبت سے جوڑ دیا جائے۔ یہ بھی بڑا جہاد ہے جو کرنے کی ضرورت ہے۔

پھر یہ ہے کہ اگر قرآن کا کوئی حکم یا اُس کی حکمت سمجھ نہ آئے یا کسی معاشرتی اقدار، تصور عدل سے ٹکراتا ہوا محسوس ہو تو پھر بھی عمل ترک نہ کرے اور یہی گمان رکھے کہ اس میں میری بھلائی ہے۔ یہ واجب محبت ہے۔ قرآن سے ہمیں ایسی ہی محبت ہونی چاہیے۔

ایک عورت کو زیورات بہت پسند ہیں، لیکن وہ زکوٰۃ کے بارے میں بھی بہت محتاط ہے تو اب یہ زیور کی مباح محبت ہے۔ لیکن یہ صورت حال ہو کہ زیور تو بہت پسند ہوں، مگر زکوٰۃ دینے کی ہمت نہیں ہو تو اس طرح ایک مباح محبت حرام ہوگئی۔ زیور عورت کو پسند ہے، اللہ نے خریدنے اور پہننے سے منع نہیں کیا لیکن اتنی محبت نہ ہوجائے کہ زیور خرید خرید کر جمع کرلیں، خوب پہنیں اور "بطر" کا شائبہ ہوجائے۔ یا پھر زکوٰۃ ادا نہ کی تو وبال سر پر آ گیا۔ خلاصہ یہ کہ اچھی خاصی مباح محبت ہماری غلطیوں کی بنا پر ناجائز اور حرام محبت میں تبدیل (convert) ہوجاتی ہے۔

ایک اور مثال دیکھیں کسی کے بھائی کی شادی تھی، بہت کوشش کے باوجود تقریب مخلوط ہوئی

اور چوں کہ بھائی کی شادی تھی اس لیے شرکت کرنا بھی ضروری تھا۔لیکن بھائی کی محبت کے نتیجے میں اللہ کی ناراضی مول لی، قرآن کا حکم توڑا اور اللہ کے رسول ﷺ کی سنت پر سمجھوتا (compromise) کیا۔

اگر آپ کے دل میں یہ خوف آتا ہے کہ میرا شمار اُن اُمتیوں میں سے نہ ہو جو آپ ﷺ کے لیے رنج اور رسوائی کے باعث ہوں گے۔تو یہ آپ ﷺ سے محبت کی نشانی ہے، یہ بہت نیک جذبہ ہے۔ہمیں ہر گھڑی امتی ہونے کا پاس ہونا چاہیے۔

اللہ کی قدرت کی نشانیاں دیکھ کر شعوری طور پر دل سے سبحان اللہ نکلتا ہو یہ مستحب ہے۔شعوری طور پر اللہ کی نعمتوں کا ادراک رکھیں، اللہ کی مہربانیوں اور لطافتوں پر نظر رکھیں اور ان احسانات کے بدلے اللہ کا شکر بجالائیں۔

قرآن پڑھنے پڑھانے والوں سے بھی محبت رکھیں، کیوں کہ نیک لوگوں سے محبت رکھنا اللہ سے محبت کی راہ آسان کرتا ہے۔اس نیت سے محبت کریں کہ وہ ہمیں اللہ سے اور دین سے جوڑنے کی کوشش کر رہے ہیں۔

نتیجہ :

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ جب جائز چیزوں کی محبت واجب محبتوں پر حاوی ہو جائے تو یہ حرام کے درجے پر پہنچ جاتی ہے۔اور ہمارا امتحان یہ ہے ان محبتوں میں اعتدال رکھا جائے۔دنیاوی رشتوں کی محبتیں اور جبلی محبتیں کبھی اللہ اور اس کے رسول ﷺ اور جہاد کی محبت سے آگے نہ بڑھ جائے۔

قرآن کا کثرت سے مطالعہ کریں اور کائنات پر غور کیا کریں تا کہ اللہ کی عظمت پیدا ہو۔نبی اکرم ﷺ کی سیرت اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے حالات زندگی پڑھا کریں تا کہ اُن سے جذباتی وابستگی اور اپنائیت کا تعلق پیدا ہو۔رسول اللہ ﷺ کے صحابہ رضی اللہ عنہم سے بھی محبت کرنی چاہیے، ان کی تعظیم اور احترام بھی لازم ہے، یہ بھی واجب محبت ہے۔اور اپنے جذبات کو ایسے ڈھالنا ہے کہ ہر چیز سے اللہ کی خاطر محبت کرنے لگیں۔

اللہ تعالیٰ خالص محبت کی توفیق عطا فرمائے! آمین، یارب العالمین۔

حرص (Greed)

حرص جس کو ''لالچ'' اور ''طمع'' بھی کہا جاتا ہے۔ یہ انسانوں کے اندر پائی جاتی ہے۔ دیکھا جائے تو اپنی ذات میں یہ نہ اچھی ہے، نہ بُری ہے۔ بلکہ اس کا استعمال اس کو اچھا یا بُرا بناتا ہے۔

مطلوب حرص:

اگر انسان میں اپنے لیے بھلائی کا جذبہ ہے، اپنے ساتھ مخلص (sincere) ہے، اور اپنوں کے لیے بھلائی کا حریص ہے تو الحمدللہ یہ بہت اچھا جذبہ ہے۔ انسان کے اندر یہ خواہش وتمنا ہونی چاہیے کہ میرا بھلا ہو جائے اور دوسروں کا بھی بھلا رہے تو یہ حرص بُری نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

{لَقَدْ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ اَنْفُسِكُمْ عَزِيْزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيْصٌ عَلَيْكُمْ بِالْمُؤْمِنِيْنَ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ} (التوبۃ:۱۲۸)

''البتہ تحقیق آ گیا تمہارے پاس ایک رسول تم ہی میں سے، تمہارا نقصان میں پڑنا اس پر شاق گزرتا ہے۔ تمہاری فلاح کا وہ حریص ہے۔ ایمان لانے والوں کے لیے وہ شفیق اور رحیم ہے۔''

اس مقام پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے لفظ ''حریص'' استعمال ہوا ہے، آپ ﷺ کے دل میں شدید تمنا تھی کہ انسانیت فلاح پالے۔ ایسی حرص انتہائی مبارک ہے جو دوسروں کو جنت کے اعلیٰ درجوں تک پہنچانے کے لیے ہو اور دوسروں کو آگ سے بچانے کے لیے ہو۔ سورۃ البقرہ میں مسلمانوں کو خطاب کیا گیا ہے:

{اَفَتَطْمَعُوْنَ اَنْ يُّؤْمِنُوْا لَكُمْ} (البقرۃ:۷۵)

''کیا تم طمع رکھتے ہو، اس بات کی کہ وہ تمہاری بات کی تصدیق کریں گے۔''

یہاں بنی اسرائیل اور اُن کے بارے میں مسلمانوں کے نیک خیالات کا ذکر ہے۔ مسلمانوں کا یہ خیال تھا کہ مشرکین کے پاس کبھی کوئی رسول نہیں آیا، یہ ہمیشہ رسالت کے آداب سے بیگانہ رہے، کتاب کے جاننے والے نہیں تھے، اس لیے یہ اسلام کی اتنی شدید مخالفت کر رہے ہیں۔ اس کے برعکس بنی اسرائیل جب اسلام کی دعوت اور پکار سنیں گے تو وہ نبی اکرم ﷺ پر فوراً ایمان لے آئیں گے۔ یعنی مسلمانوں کو بنی اسرائیل کے بارے میں حرص تھی کہ وہ بھی مشرف باسلام ہو جائیں۔ تو یہ ایسی حرص ہے کہ انسان کے پاس اگر کوئی خیر ہے یا کوئی اچھی چیز ہے اور اس کو حرص

ہے کہ یہ خیر اور لوگوں کو بھی مل جائے کوئی محروم نہ رہے۔ دل میں لالچ اور حرص پیدا ہو کہ دوسرے بھی اس سے مستفید ہوں، فائدہ اُٹھائیں۔ یہ تو بے غرضی والی حرص ہے۔ نبی اکرم ﷺ نے فرمایا حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے:

((احْرِصْ عَلَى مَايَنْفَعُكَ)) (۱)

''ان کاموں کی حرص کرو، جو تم کو فائدہ پہنچانے والے ہیں۔''

مثال کے طور پر اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے:

{فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ} (البقرۃ:۱۴۸)

''نیکیوں میں سبقت کرو۔''

{وَسَارِعُوْا اِلٰى مَغْفِرَةٍ} (آل عمران:۱۳۳)

''دوڑ جاؤ اللہ کی مغفرت کی طرف۔''

ہمیں یہ حرص ہونی چاہیے کہ مغفرت میرے حصے میں آ جائے اور یہ حرص ہونی چاہیے کہ بہت سارے نیک اعمال آخرت کے لیے ذخیرہ کر لیں۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا شوق بھی اس ضمن میں قابل دید تھا۔ جیسے ہی نبی ﷺ کوئی ارشاد فرماتے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اُس پر عمل کرنے کو لپکتے۔ مثلاً ایک حدیث میں ذکر ہے کہ کوئی شخص اگر کسی مسلمان کی نماز جنازہ میں شریک ہو تو اُس کو ایک قیراط اجر ملتا ہے اور اگر تدفین میں بھی شریک رہے تو دو قیراط اجر ملتا ہے۔ ''قیراط'' وزن کا ایک پیمانہ ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ نے یہ حدیث مبارکہ سن کر فرمایا: ''افسوس ہم نے بہت سے قیراط ضائع کر دیے۔ اگر حدیث پہلے سنی ہوتی تو ہم ضائع نہ کرتے۔'' یعنی نیکیاں کمانے کی حرص ہوا کرتی تھی۔ کوئی موقع چھوٹنے نہ پائے۔

تو ہم بھی اگر کسی کی عبادت کا یا نیک اعمال کا سنیں تو ہمیں بھی اسے اختیار کرنے کی حرص ہونی چاہیے۔ کوشش کریں کہ کوئی نہ کوئی نیکی اعمال نامے میں ہمہ وقت جمع ہوتی رہے۔

کوئی سنت خواہ چھوٹی سے چھوٹی بھی ہو، اُس پر عمل کی جستجو ہونی چاہیے۔ اصلاحی خطبات میں مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا ایک واقعہ لکھا ہے کہ حضرت ایک دفعہ کسی گاؤں میں دعوت کے لیے جا رہے تھے، زوجہ بھی ساتھ میں تھیں۔ جنگل میں پیدل کا سفر تھا اور ساتھ میں کوئی غیر بھی نہیں تھا۔ جب جنگل کے درمیان پہنچے تو خیال آیا نبی اکرم ﷺ کی بہت سی سنتوں پر عمل کی توفیق ہو گئی ہے۔ لیکن اہلیہ کے ساتھ دوڑ لگانے کا ابھی تک موقع نہیں ملا۔ آپ نے سوچا کیوں نہ اس سنت پر بھی عمل

(۱) صحیح مسلم، کتاب القدر، باب فی الأمر بالقوۃ وترک العجز۔۔۔

ہوجائے۔تو آپ نے اہلیہ کے ساتھ دوڑ لگا کر اُس پر بھی عمل کرلیا۔کیا شوق ہے سنت پر عمل کرنے کا اور ہر سنت کتنی خوب صورت ہے۔مولانا اشرف علی تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو دوڑ لگانے کا شوق نہیں تھا مگر سنت پر عمل کی غرض سے انھوں نے یہ کیا۔یہ ہے اتباع سنت! یہ اچھی حرص ہے۔

حدیث مبارکہ میں ارشاد ہے کہ ''دو چیزوں کا حریص کبھی سیر نہیں ہوتا، دو چیزوں کا لالچ ایک دفعہ لگ جائے تو وہ لالچ کبھی ختم نہیں ہوتا۔ایک علم اور دوسری دولت''

علم جتنا بھی ہو، کم لگتا ہے، طلب بڑھتی رہتی ہے اور دل چاہتا ہے کہ اور علم جمع ہو جائے اور انسان کے پاس جتنی دولت آجائے اُسے کم ہی لگتی ہے۔ظاہر ہے ان دو چیزوں میں سے علم کی حرص اچھی شے ہے۔

بُری حرص:

اب بُری حرص کی طرف آتے ہیں۔بُری حرص وہ ہے جو دنیا کے لیے ہو۔حدیث مبارکہ میں آتا ہے:

((أَنَّ رَسُولَ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَوْ أَنَّ لِابْنِ آدَمَ وَادِيًا مِنْ ذَهَبٍ أَحَبَّ أَنْ يَكُونَ لَهُ وَادِيَانِ وَلَنْ يَمْلَأَ فَاهُ إِلَّا التُّرَابُ)) (۱)

''ابن آدم کو ایک وادی سونے سے بھری ہوئی بھی مل جائے تو وہ چاہے گا کہ دو مل جائیں۔ اور ابن آدم کا پیٹ سوائے مٹی کے اور کوئی چیز نہیں بھر سکتی۔''

قرآن میں آتا ہے۔

{أَلْهَاكُمُ التَّكَاثُرُ ۝ حَتَّىٰ زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ} (التکاثر: ۱، ۲)

''غفلت میں ڈالے رکھا تم کو تکاثر کی دوڑ نے حتیٰ کہ تم قبر تک پہنچ گئے۔''

پیسے کی حرص اگر انسان کو ہو جائے تو پیچھا نہیں چھوڑتی۔بہت خراب اور مہلک چیز ہے، انتہائی منحوس ہے۔یہ انسان کی زندگی کا مزہ بھی کرکرا کر دیتی ہے۔عام طور پر حرص اور بخل ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔یعنی مال و دولت آ بھی جائے اور پھر کہیں جائے بھی نہ۔یعنی جو حریص ہوتے ہیں وہ عام طور پر بخیل بھی ہوتے ہیں۔جمع کر کر کے رکھتے ہیں، دیکھ دیکھ کر خوش ہوتے ہیں۔ہمارے معاشرے میں جو آخرت کا حریص ہے اُسے انتہا پسند (extremist) کہہ دیتے ہیں اور جو دنیا کا حریص ہے اُسے ہم عالی ہمت اور اولوالعزم (ambitious) کے الفاظوں میں سراہتے ہیں۔یعنی دنیا کا

(۱) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب مایتقی من فتنۃ المال

حریص ہونا تو اچھی بات ہے اور آخرت کا حریص ہونا باعثِ شرم اور حماقت ہے۔

آخرت کا حریص پُرسکون، دنیا کا حریص بے سکون:

آخرت کا حریص ہونا انسان کو پُرسکون کر دیتا ہے اور دنیا کا حریص ہونا سکون غارت کر دیتا ہے۔ جو آخرت کے حریص ہوتے ہیں وہ کوئی شکایت نہیں کرتے کیوں کہ آخرت کے لیے زیادہ سے زیادہ جمع کرنا، زیادہ سے زیادہ تیاری کرنا اُن کے بس میں ہوتا ہے۔ سب کے لیے کیوں کہ برابر کا موقع (equal opportunity) ہے۔ یہ ایسی حرص ہے جو بآسانی پوری کی جاسکتی ہے۔ چھوٹی سی نیکی سے لے کر بڑی سے بڑی نیکی کے لیے میدان کھلا ہے۔ آئیں ہمت کریں اور نیکیوں کے خزانے اپنے نام کرلیں۔

جو دنیا کے حریص ہوتے ہیں وہ عموماً بے سکون رہتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ دنیا حاصل کرلینا انسان کے اپنے بس میں نہیں ہے جب اُسے اپنی پسند کی دنیا نہیں مل پاتی تو انسان جھنجلاتا (frustrate) ہے۔ آپ خود مشاہدہ کر سکتے ہیں یہ لفظ آج کل کتنا استعمال کیا جاتا ہے۔ اس لیے کہ دنیا کے حریص بہت جھنجلاتے (frustrate) ہیں۔ اداس (upset) رہتے ہیں۔ پریشان (tension) رہتے ہیں کیوں کہ ان کو اتنا ملتا نہیں جتنی ان میں ہوس ہوتی ہے۔ حریص لوگ لمبے لمبے منصوبے (plan) بناتے رہتے ہیں۔ ہلکان ہوتے رہتے ہیں۔ بعض دفعہ حرص لوگوں کو چوری، بے ایمانی، دھوکا اور رشوت تک پہنچا دیتی ہے۔ ہاتھ میں پیسا نہیں ہے، جائز طریقے پر اُس چیز کو حاصل کرنے کا موقع بھی نہیں مل رہا، تو پھر کیا کیا ہتھکنڈے اختیار کرنے پڑتے ہیں۔ یہ آج کل ایک عام سی چیز ہوگئی ہے۔ یہ حرص کا مظہر ہے۔ بعض لوگ معمولی معمولی چیزوں کی چوریاں کرتے ہیں مثلاً کسی کا کلپ اُٹھالیا، لپ اسٹک (lipstick) چُرالی کسی کی۔ کوئی سکہ پڑا مل گیا تو اُٹھالیا اور چُپ کر گئے۔ ایسی معمولی معمولی چیزیں، حقیر چیزیں بھی گناہ گار بنا دیتی ہیں۔ دل کے اندر لالچ اور حرص گھر کرلیتی ہے، دنیا بہت محبوب ہوجاتی ہے۔ حرص کی وجہ سے انسان کی عزت بھی ختم ہوتی ہے اور اُس کی شخصیت بھی پَنپ نہیں پاتی۔

حرص کا مظاہرہ اس بات سے ہوتا ہے کہ کوئی ہر چیز کے بارے میں پوچھنے لگے، یہ کہاں سے لیا ہے؟ کہاں ملتا ہے؟ کب لی اور کتنے کی لی؟ دنیا کی ایک ایک چیز ان کی نظروں میں رہتی ہے کسی کے پاس دیکھتے ہیں تو فوراً حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ دل میں حرص پیدا ہوجاتی ہے کہ ہمارے پاس بھی یہ چیز آجائے۔ اگر وہ چیز حاصل کرلیں تو تھوڑی دیر کی خوشی ہوتی ہے پھر کسی دوسری چیز کو کسی کے

پاس دیکھ کر پھر اُن کا سکون ختم ہوجاتا ہے۔ کوئی چیز اگر حاصل بھی ہوجائے تو وہ کافی نہیں لگتی اور نگاہیں پھر نئی اشیاء پر مرکوز ہوجاتی ہیں۔

حرص کے مقابلہ میں قناعت:

نبی اکرم ﷺ نے تو یہاں تک فرمایا ہے کہ:

((أَنَّ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ قَدْ أَفْلَحَ مَنْ أَسْلَمَ وَرُزِقَ كَفَافًا وَقَنَّعَهُ اللّٰهُ بِمَا آتَاهُ)) (۱)

''کامیاب اور بامراد ہوا وہ بندہ جس کو دولتِ اسلام نصیب ہوئی اور اس کو روزی بھی بقدر کفاف ملی اور جو اللہ نے اُسے دیا وہ اس پر قناعت کرتا ہے۔''

ایسے شخص کو نبی اکرم ﷺ نے کامیاب اور بامراد کہا ہے جس کو اللہ نے انتہائی قلیل روزی پر بھی قانع بنا دیا تو حرص کا علاج قناعت ہے۔ حدیثِ مبارکہ میں دُعا آتی ہے:

((اَللّٰهُمَّ قَنِّعْنِي بِمَا رَزَقْتَنِي وَبَارِكْ لِي فِيهِ)) (۲)

''اے اللہ مجھے قناعت کرنے والا بنا دے اس روزی پر جو تو نے مجھے دی اور اُسی میں میرے لیے برکت ڈال دے۔''

حدیث مبارکہ ہے ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((لَيْسَ الْغِنَى عَنْ كَثْرَةِ الْعَرَضِ وَلٰكِنَّ الْغِنَى غِنَى النَّفْسِ)) (۳)

''دولت مندی مال واسباب سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اصل دولت مندی دل کی بے نیازی ہے۔''

یعنی حرص کبھی بھی ختم نہیں ہوتی، چاہے لکھ پتی سے کروڑ پتی ہوجائے یا ارب پتی، کھرب پتی کیوں نہ ہوجائیں۔ حرص ختم نہیں ہوتی۔

اصل چیز دل کی بے نیازی ہے۔ ایک حدیث میں آپ ﷺ نے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے فرمایا:

أبا ذر يقول: قال رسول الله صلى الله عليه وسلم: (يا أبا ذر تقول كثرة المال الغنى؟) قلت: نعم قال: (تقول قلة المال الفقر؟) قلت: نعم قال ذلك ثلاثا

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الزکاۃ، باب فی الکفاف والقناعۃ

(۲) مصنف ابن ابی شیبۃ، کتاب الدعاء، باب مایدعو بہ الرجل بین الرکن والمقام

(۳) صحیح البخاری، کتاب الرقاق، باب الغنی غنی النفس۔۔۔

ثم قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم: (الغنی فی القلب والفقر فی القلب) (۱)

''ابوذر کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ مال زیادہ ہونے کا نام تونگری ہے؟ میں نے عرض کیا ہاں حضور ﷺ ایسا ہی سمجھا جاتا ہے۔'' تو آپ ﷺ نے فرمایا ''کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ مال کم ہونے کا نام فقیری اور محتاجی ہے۔'' میں نے عرض کیا ''ہاں! حضور ﷺ ایسا ہی خیال کیا جاتا ہے۔'' یہ بات آپ ﷺ نے تین مرتبہ ارشاد فرمائی۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا: ((اَلْغِنٰی فِیْ الْقَلْبِ وَالْفَقْرُ بِالْقَلْبِ))

''دولت مندی دل کے اندر ہوتی ہے اور فقیری اور محتاجی بھی دل کے اندر ہوتی ہے۔''

جو جتنا حریص ہوتا ہے اتنا ہی فقیر ہوتا ہے۔ جتنا بھی زیادہ مال آئے اس کو کم ہی لگتا ہے۔ الماریاں بھری ہوئی ہیں کپڑوں سے، لیکن کہیں گے کچھ پہننے کو ہے ہی نہیں۔ بینک بیلنس بھرے پڑے ہیں۔ گھر اور جائیدادیں کئی رقبوں پر پھیلی ہوئی ہیں۔ پھر بھی دل اُسی میں اٹکا ہوا ہے جو دوسروں کے پاس ہے، اصل فقر تو یہ ہے۔ اور جو ہر حال میں اللہ کا شکر کرے، وہی اصل غنی ہے۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، انصار میں سے کچھ لوگوں نے ایک دفعہ آپ ﷺ سے کچھ طلب کیا۔ آپ ﷺ نے اُن کو عطا فرمایا مگر اُن کی مانگ ختم نہ ہوئی۔ انہوں نے پھر طلب کیا آپ ﷺ نے پھر عطا فرمایا یہاں تک کہ جو کچھ آپ ﷺ کے پاس تھا وہ سب ختم ہو گیا اور کچھ نہ رہا۔ تو آپ ﷺ نے ان انصار سے فرمایا:

''سنو! جو مال دولت بھی میرے پاس ہوگا اور کہیں سے آئے گا میں اس کو تم سے بچا کر نہیں رکھوں گا اور اپنے پاس ذخیرہ نہیں کروں گا۔ بلکہ تم کو دیتا رہوں گا۔ مگر یہ بات خوب سمجھ لو کہ اس طرح مانگ مانگ کر حاصل کرنے سے آسودگی اور خوش عیشی حاصل نہ ہوگی۔ اللہ کا قانون یہ ہے کہ جو خود عفیف (یعنی اپنی عزت کو سنبھالنے والا) بننا چاہتا ہے حرص نہیں کرتا، ہاتھ نہیں پھیلاتا کسی کے آگے۔ یعنی جو دوسروں کے آگے اپنے آپ کو ہاتھ پھیلانے سے بچانا چاہتا ہے تو اللہ تعالیٰ اُس کی مدد فرماتا ہے اور سوال کی ذلت سے اُس کو بچا دیتا ہے اور جو کوئی بندوں کے سامنے اپنی محتاجی ظاہر کرنے سے بچنا چاہتا ہے یعنی اپنے آپ کو بندوں کا محتاج اور نیاز مند بنانا نہیں چاہتا، اللہ تعالیٰ اس کو بندوں سے بے نیاز کر دیتا ہے۔''

اس کی ہمیں تمنا کرنی چاہیے۔ حرص کیا کرتی ہے چوری کی بات ہم نے کی، دوسروں سے مانگنے کی عادت، یہ دے دو، وہ دے دو۔ اور مانگنا چاہے کھلم کھلا بھیک مانگنا ہو یا فرمائش کرنا حرص ہی ہے۔

---

(۱) المعجم الکبیر للطبرانی، باب و من غرائب أبی ذر رضی اللہ عنہ

حرص اور بخل:

ہم نے عرض کیا تھا کہ حرص کے ساتھ بخل ضرور ہوتا ہے۔ حریص چاہتا ہے چیزیں آتی رہیں اور خرچ بھی نہ ہوں۔ اس وجہ سے وہ ان نعمتوں سے لطف اندوز نہیں ہو پاتا۔ نہ خود پر خرچ کرتا ہے اور نہ دوسروں کو دینا چاہتا ہے۔ ان چیزوں کی طرف سے فکر مند رہتا ہے، دھڑکا لگا رہتا ہے کہیں میرے پاس سے چلی تو نہیں جائے گی، کہیں کوئی نقصان نہ پہنچ جائے۔ ایسے دنیا جمع کر کے تو کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔

سو اللہ تعالیٰ سے غنیٰ اور قناعت کی دُعا کرنی چاہیے۔ یہ حرص کا علاج ہے جو اللہ نے دے دیا ہے اُس پر اللہ قانع کر دے۔ اللہ تعالیٰ لالچ سے بچالے۔

رسول اکرم ﷺ نے بھی قناعت مانگی ہے:

((اَللّٰھُمَّ اِنِّیْ اَعُوْذُبِکَ مِنْ عِلْمٍ لاَ یَنْفَعُ وَمِنْ قَلْبٍ لاَ یَخْشَعُ وَمِنْ نَفْسٍ لاَ تَشْبَعُ وَمِنْ دَعْوَۃٍ لاَ یُسْتَجَابُ لَھَا)) (۱)

''اے اللہ! میں تیری پناہ مانگتا ہوں ایسے علم سے جو نفع نہ دے اور ایسے دل سے جو بے خوف ہو اور ایسے نفس سے جو کہ سیر نہ ہو (جس کی خواہشات ختم ہی نہ ہوں) اور ایسی دُعا سے جو مقبول نہ ہو۔''

اللہ تعالیٰ ہم سب کو حرص اور لالچ سے اپنی پناہ میں رکھے، یہ زندگی کا سکون ختم کرنے والی، برباد کرنے والی چیز ہے۔ بلکہ ایک اور حدیث مبارکہ میں نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((اِیَّاکُمْ وَالشُّحَّ فَاِنَّمَا ھَلَکَ مَنْ کَانَ قَبْلَکُمْ بِالشُّحِّ اَمَرَھُمْ بِالْبُخْلِ فَبَخِلُوْا وَاَمَرَھُمْ بِالْقَطِیْعَۃِ فَقَطَعُوْا وَاَمَرَھُمْ بِالْفُجُوْرِ فَفَجَرُوْا)) (۲)

''حرص اور طمع سے بچو کیوں کہ تم سے پہلی قومیں اسی حرص سے تباہ ہوئیں۔ اسی نے اُن کو بخل کرنے کو کہا تو اُنہوں نے بخل اختیار کیا۔ اسی نے اُن کو قطع رحمی (یعنی حقوق قرابت کی پامالی کے لیے) کہا تو انہوں نے قطع رحمی اختیار کی۔ اسی نے اُن کو بدکاری کے لیے کہا تو انہوں نے بدکاریاں کیں۔''

یہ سب چیزیں کس سے پیدا ہوئیں؟ حرص سے۔ یہ سب حرص کے پھل پھول ہیں۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنی پناہ میں رکھے۔ ان بُرائیوں اور خباثتوں سے محفوظ رکھے۔

(آمین یارب العالمین)

---

(۱) صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء والتوبۃ والاستغفار، باب التعوذ من شر ما عمل۔۔۔

(۲) سنن ابی داؤد، کتاب الزکاۃ، باب الشح

خیانت

خیانت پر گفتگو کا آغاز ہم صحیح مسلم کی ایک حدیث سے کریں گے، آپ ﷺ نے فرمایا:

((أَرْبَعَةٌ كَانَتْ فِيهِ خَصْلَةٌ مِنَ النِّفَاقِ حَتَّى يَدَعَهَا إِذَا حَدَّثَ كَذَبَ وَإِذَا وَعَدَ أَخْلَفَ وَإِذَا عَاهَدَ غَدَرَ وَإِذَا خَاصَمَ فَجَرَ))(۱)

''منافق کی چار علامتیں ہوتی ہیں: (۱) جب بات کرتا ہے جھوٹ بولتا ہے۔ (۲) جب وعدہ کرتا ہے، خلاف ورزی کرتا ہے۔ (۳) جب اس کے پاس امانت رکھوائی جاتی ہے تو خیانت کرتا ہے۔ (۴) جب جھگڑتا ہے تو پھٹ پڑتا ہے یعنی غصہ میں آپے سے باہر ہو جاتا ہے۔

نفاق:

ہم ان صفحات میں دراصل نفاق ہی کے مختلف پہلو دیکھنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ نفاق کی بیماری اتنی گھمبیر ہے، اتنی ہلاکت خیز، خوف ناک اور پُر پیچ ہے کہ کسی ایک عنوان کے تحت اس کو سمجھنا ناممکن ہے، ہم کوشش کر رہے ہیں کہ کئی سمتوں سے اس کا گھیرا تنگ کریں۔ سر دست ہم خیانت کے پہلوؤں پر بات کریں گے، کیوں کہ کچھ سطور قبل ہمارے سامنے حدیث آئی تھی کہ منافق کے پاس جب امانت رکھوائی جاتی ہے تو وہ خیانت کر بیٹھتا ہے۔ عربی میں اس کو ''غِش'' بھی کہا جاتا ہے۔ یہ ایک طرح سے دھوکا ہوتا ہے، خیانت بھی ایک طرح سے دھوکا ہی ہے، اس کو غُلول بھی کہتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے مومنوں کی ایک صفت یہ بیان فرمائی ہے:

{وَالَّذِينَ هُمْ لِأَمَانَاتِهِمْ وَعَهْدِهِمْ رَاعُونَ} (المؤمنون: ۸)

''مومن تو وہ ہیں جو اپنی امانتوں کی اور عہدوں کی نگرانی کرتے ہیں۔''

یہ شان ہوتی ہے مومن کی۔ قرآن میں خیانت کی بہت مذمت کی گئی ہے۔ منافقین خود خیانت کرتے تھے اور نبی اکرم ﷺ کو الزام دیتے تھے۔ یہ بھی منافق کا ایک طریق واردات ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو ٹھیک نہیں کرتا اور دوسروں پر الزام تراشیاں کرتا رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نبی اکرم ﷺ کے حق میں فرمایا کہ:

{وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ وَمَنْ يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيَامَةِ ثُمَّ تُوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ} (آل عمران: ۱۶۱)

''کسی نبی کا یہ کام نہیں ہو سکتا کہ وہ خیانت کر جائے اور جو کوئی خیانت کرے تو وہ اپنی خیانت سمیت قیامت کے روز حاضر ہوگا۔ پھر ہر جان کو اُس کی کمائی کا پورا پورا بدلہ مل جائے گا اور

(۱) صحیح مسلم، کتاب الذکر والدعاء، باب التعوذ من شر ما عمل۔۔۔

کسی پر کچھ ظلم نہ ہوگا۔''

جو نرمی رسول ﷺ کے دل میں تھی، جو خیر خواہی آپ ﷺ کے دل میں تھی، اس کے تحت ان منافقین کے لیے بھی آپ ﷺ کے دل میں درد تھا۔ آپ ﷺ ان کی بھی حمایت کیا کرتے تھے۔ نبی اکرم ﷺ کو خیانت کاروں کی حمایت سے روک دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

''آپ ﷺ خیانت کرنے والوں کی طرف سے جھگڑا کرنے والے مت بنیے، چھوڑ دیجیے اِن کو۔ اے نبی ﷺ! آپ ﷺ مومنوں کی حمایت کیجیے، ان کی طرف سے آپ ﷺ اللہ سے درخواست کیجیے۔ ان منافقوں کو اپنے حال پر چھوڑ دیجیے۔''

سورۃ انفال میں فرمایا ہے:

{اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْخَآئِنِیْنَ} (الانفال: ۵۸)

''بے شک اللہ خیانت کرنے والوں سے محبت نہیں کرتا۔''

سورۃ مومن میں فرمایا:

{یَعْلَمُ خَآئِنَۃَ الْاَعْیُنِ وَمَا تُخْفِی الصُّدُوْرُ} (المؤمن: ۱۹)

''اللہ تو نگاہوں کی خیانت کو بھی جانتا ہے اور جو کچھ سینے چھپاتے ہیں اُس کو بھی جانتا ہے۔''

نبی اکرم ﷺ نے ہمیں امانت کی بہت تاکید کی ہے اور خیانت سے بچنے کی تلقین کی ہے۔ مسند احمد میں حدیث مبارکہ ہے ابوعمامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

((یُطْبَعُ الْمُؤْمِنُ عَلَی الْخِلَالِ کُلِّھَا اِلَّا الْخِیَانَۃَ وَ الْکَذِبَ)) (۱)

''مومن کی طبیعت اور فطرت میں ہر خصلت کی گنجائش ہے سوائے خیانت اور جھوٹ کے۔''

مومن نہ خیانت کر سکتا ہے اور نہ جھوٹ بول سکتا ہے، اس کے علاوہ بہت سی کمزوریاں مومن کے اندر ہو سکتی ہیں۔ لالچ ہو سکتا ہے، کسی بے حیائی کے کام میں بھی کبھی ملوث ہو سکتا ہے۔ غیبت بھی کر سکتا ہے۔

جامع ترمذی میں ایک حدیث مبارکہ میں ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے مروی ہے آپ ﷺ نے فرمایا:

((اَلتَّاجِرُ الْاَمِیْنُ الصَّدُوْقُ الْمُسْلِمُ مَعَ الشُّھَدَاءِ یَوْمَ الْقِیَامَۃِ)) (۲)

''سچا اور امانت دار سوداگر انبیاء، صدیقین اور شہداء کے ساتھ ہوگا۔''

ابوداؤد میں ایک اور حدیث ہے

((عَنْ سُفْیَانَ بْنِ أَسِیْدِ الْحَضْرَمِیِّ قَالَ سَمِعْتُ رَسُوْلَ اللّٰہِ صَلَّی اللّٰہُ عَلَیْہِ وَسَلَّمَ

---

(۱) مسند أحمد، مسند الانصار، حدیث ابو عمامہ الباھلی رضی اللہ عنہ

(۲) سنن ابن ماجہ، کتاب التجارۃ، باب الحث علی المکاسب

يَقُولُ كَبُرَتْ خِيَانَةً أَنْ تُحَدِّثَ أَخَاكَ حَدِيثًا هُوَ لَكَ بِهِ مُصَدِّقٌ وَأَنْتَ لَهُ بِهِ كَاذِبٌ)) (۱)

سفیان ابن اُسَید الحزرمی رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خود سنا ہے:

''یہ بہت ہی بڑی خیانت ہے کہ تم اپنے بھائی سے کوئی بات جھوٹی بیان کرو جب کہ وہ تم کو اس بیان میں سچا سمجھتا ہو۔''

یعنی ایک شخص کا اتنا رعب ہے، اس انداز کے جھوٹ کو بھی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیانت سے تعبیر کیا۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے بہت عرصہ غلام رہے، وہ فرماتے ہیں کہ کوئی خطبہ ایسا نہ تھا جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا ہو اور اُس میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہ فرمایا ہو کہ:

((لَا إِيمَانَ لِمَنْ لَا أَمَانَةَ لَهُ وَلَا دِينَ لِمَنْ لَا عَهْدَ لَهُ)) (۲)

''اس شخص کا کوئی دین نہیں، جس میں عہد کا پاس نہیں اور ایسے شخص کا کوئی ایمان نہیں، جس میں امانت نہیں۔''

عربی زبان میں امانت کے معنی ہیں ''کسی شخص پر کسی بات کا بھروسا کرنا۔'' یہ لفظی معنی ہیں ،یعنی بھروسا (trust) کرنا کسی پر، لہٰذا ہر وہ چیز جو دوسرے کے سپرد کی گئی ہو، اس کے حوالے کی گئی ہو یہ سوچ کر کہ یہ اس کا خیال رکھے گا، اس کا حق ادا کرے گا، وہ چیز امانت بن جاتی ہے۔ تو یوں جانیں کہ عہدہ بھی امانت ہے۔ ہر ذمہ داری جو سونپی جائے امانت ہے۔ ذمہ داری کا حق ادا کرنا پڑے گا۔

ہمارے ہاں امانت کا تصور بہت محدود ہو گیا ہے۔ ہم سمجھتے ہیں کہ صرف مال دولت، نقد پیسا، زیور رکھنا ہی امانت ہے، جب وہ مانگے تو پوری پوری واپس کر دے، صرف یہ امانت ہے۔ حالاں کہ امانت کے بہت وسیع معنی ہیں۔

مختلف امانتیں:

ہم دیکھیں گے کہ کیا کیا امانت کے زمرے میں آتا ہے۔ اور کیا ہم خیانت کے مرتکب تو نہیں ہو رہے۔

اللہ کی امانت:

اللہ کی امانت سے گفتگو کا آغاز کرتے ہیں۔ کیوں کہ ہمارے خالق کا ہی ہم پر سب سے زیادہ حق ہے۔ اللہ نے ہمارے پاس کیا چیز امانت رکھوائی ہے۔ سورۃ الاحزاب میں اس کا ذکر آتا ہے:

{إِنَّا عَرَضْنَا الْأَمَانَةَ عَلَى السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَالْجِبَالِ فَأَبَيْنَ أَنْ يَحْمِلْنَهَا

---

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب الأدب، باب فی المعاریض

(۲) مسند احمد، مسند المکثرین، حدیث انس بن مالک

وَاَشْفَقْنَ مِنْهَا وَحَمَلَهَا الْاِنْسَانُ} (۷۲)

''اور ہم نے اس امانت کو زمین اور آسمانوں اور پہاڑوں پر پیش کیا تو اُنھوں نے اس کو اُٹھانے سے انکار کر دیا اور اس سے ڈر گئے اور انسان نے اس کو اُٹھالیا۔''

یہ کس امانت کا ذکر کیا جا رہا ہے؟ وہ کون سی امانت ہے جو ہم نے اُٹھالی؟ کسی انسان کو بھی وہ عالم یاد نہیں، جب اُس نے بارِ امانت اُٹھایا تھا لیکن اس کے باوجود ہم ایمان رکھتے ہیں کہ اللہ نے ایک خاص امانت ہم انسانوں کو دی ہے۔ ''دین'' جس کے لیے ہمیں بااختیار زندگی دی ہے اور اس بااختیار زندگی کے ساتھ اللہ نے ایک جسم عطا کیا ہے۔ جس میں آنکھ دی ہے، کان دیے ہیں، زبان دی ہے۔ یہ سب ہمارے پاس امانت ہیں۔

اپنی ذات کی امانت:

مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے اپنے اصلاحی خطبات میں بہت تفصیل سے اس معاملے پر روشنی ڈالی ہے۔ سب سے پہلے زندگی کی امانت کا ذکر کیا گیا ہے اور پھر زندگی جس جسم کے اندر مقید ہے وہ بذات خود ایک امانت ہے۔ یاد رکھیں اللہ تعالیٰ نے یہ زندگی ہمیں کسی صلے کے طور پر نہیں دی، نہ ہم نے مانگی تھی بلکہ ہمارے پاس رکھوا دی گئی ہے۔ جسم بھی ہماری ذاتی جاگیر نہیں ہے، جس کے ساتھ ہم جو چاہیں سو کریں، بلکہ اللہ نے ہمارے پاس رکھوایا ہے۔ اگر کوئی یہ سمجھتا ہے کہ میں اپنے ہاتھ یا اپنی آنکھ کا مالک ہوں تو یہ اُس کی غلط فہمی ہے۔ وہ بھلا مالک کیسے بن گیا؟ کیا اُس نے یہ اعضا خریدے ہیں؟ جو شے بغیر ملکیت کے کسی کے پاس رکھوائی جائے، وہ امانت ہی ہوتی ہے۔ اور اگر ہم دنیا بھر کی دولت خرچ کر دیتے، تب بھی یہ آنکھیں نہ خرید سکتے۔ یہ سراسر اللہ کی عنایت ہے، اللہ ہی نے ان میں دیکھنے کی صلاحیت رکھی ہے تو ہم دیکھ سکتے ہیں۔ لہٰذا یہ آنکھیں امانت ٹھہریں، ان کی حفاظت کرنا اور ان کا حق ادا کرنا ہے۔ سورۃ مومن کی آیت گزر چکی ہے کہ اللہ آنکھوں کی خیانت کو بھی جانتا ہے۔ تو آنکھوں کی امانتیہ ہے کہ ان کو اگر اسی طرح استعمال کیا جائے، جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہدایت فرمائی ہے، جیسی اس کی مرضی ہے تو پھر امانت کا حق ادا کر دیا۔ اگر ہم ان چیزوں کو دیکھنا شروع کر دیں جن پر نگاہ کرنے سے روکا گیا ہے تو یہ نظروں کی خیانت ہے۔ اور ایمان تو ہے ہی امانت کا نام، ایمان دار امین ہوتا ہے۔ نبی ﷺ نے فرمایا، ''اس کا کوئی ایمان نہیں جس میں امانت کی پاس داری نہیں۔'' یعنی ایمان کا تقاضا ہے کہ آنکھوں کو امانت سمجھ کر اُن کی حفاظت کی جائے۔

اسی طرح کان بھی امانت ہیں، اللہ تعالیٰ نے ہمیں سننے کی صلاحیت دی ہے۔ ہم تفریحی باتیں بھی سن سکتے ہیں، ایک دوسرے کی گفتگو بھی سن سکتے ہیں، کئی آوازیں سن سکتے ہیں لیکن بس چند آوازوں پر پابندی ہے۔ غیبت نہ سُنی جائے، موسیقی سے بچا جائے اور فحش باتوں کو پھٹکنے بھی نہ دیا

جائے۔ اگر اپنے کانوں کو کچھ چیزوں سے بچالیا تو ہم نے امانت کی حفاظت کر لی اور اگر ان حرام چیزوں میں مبتلا ہو گئے تو گویا خیانت کر ڈالی۔

اسی طرح زبان بھی امانت ہے۔ جن باتوں سے اللہ نے منع فرمایا ہے وہ ہرگز زبان پر نہ آئیں ورنہ یہ خیانت ہو جائے گی۔ کفریہ اور شرکیہ کلمات، فحش اور بے حیائی والے کلمات ادا نہ کرے زبان سے۔ اللہ کے ذکر میں اور اللہ نے جن باتوں کا حکم دیا ہے، اُن میں زبان کو مصروف رکھے۔ زبان اُس کے ذکر سے تر رکھے، ایسا شخص زبان کی امانت کا حق ادا کر دے گا۔

سو پہلی امانت زندگی اور صحیح سالم جسم ہے۔ اسی لیے اسلام میں خودکشی حرام ہے۔ اگر یہ ذاتی چیز ہوتی تو اس کو سلب کرنے کا اختیار ہوتا۔ چوں کہ جان ہماری ملکیت نہیں ہے۔ یہ تو ہمارے پاس اللہ کی امانت ہے۔ ہم اس میں خیانت کیسے کر سکتے ہیں۔ اللہ نے جان دی ہے اور صرف اللہ ہی کو حق ہے کہ وہ جب چاہے اُس کو لے لے۔ ہم اس کو ضائع نہیں کر سکتے۔ یہ خیانت ہو جائے گی۔ تو اسلام میں خودکشی کا تصور موجود نہیں۔ خودکشی کرنا کبیرہ گناہ ہے، یہ بہت بڑی خیانت ہے۔ اللہ کی مرضی کے خلاف اپنی جان خود لے لی۔ یہ چند چیزیں ہیں جن کا تعلق اللہ تعالیٰ سے ہے۔

انسانوں کی امانتیں اور ان میں خیانت:

انسانوں کے ساتھ تعلقات اور معاملات پر نظر دوڑائیں کہ انسانوں کے ساتھ خیانت کس کس طرح کی جاتی ہے؟ مال و دولت اور زیورات میں تو اب کم ہی دیکھنے میں آتا ہے کہ کسی نے کسی کے ساتھ خیانت کی لیکن پھر بھی اگر کسی کے پاس کوئی امانت ہو تو اس کا خیال رکھنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں خاص طور پر ہمیں یہ نصیحت فرمائی ہے۔

{إِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُكُمْ أَنْ تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلٰى أَهْلِهَا} (النساء:۵۸)

''کہ اللہ تعالیٰ تمہیں حکم دیتا ہے کہ تم امانتیں اُن کے اہل کی طرف لوٹا دو۔''

جب سے بینک اور لاکر کا رواج پڑا ہے، تب سے لوگ ایک دوسرے کے پاس اپنی چیزیں عام طور پر نہیں رکھواتے۔ لیکن چھوٹی موٹی چیزوں کا لین دین ہوتا رہتا ہے۔ کتابیں، گھر کے استعمال کی چیزیں، کھانے پینے کی چیزیں وغیرہ۔ اکثر لوگ کتابیں پڑھنے لے جاتے ہیں اور پھر کبھی واپس نہیں کرتے، یہ بھی خیانت ہے۔ یا تو لاپرواہی برتنے کی وجہ سے کھو جاتی ہیں، یا بچوں کے ہاتھوں پھٹ جاتی ہیں یا اُن کے گھر سے کوئی اور اُٹھا کر لے جاتا ہے۔ اس کا بھی خیال رکھنا چاہیے، وہ کتاب یا کوئی اور شے جو آپ مانگ کر لائے تھے، وہ لوٹانا ضروری ہے۔ مانگی ہوئی چیزیں ضرور واپس کریں، وہ امانت ہیں۔ عموماً ہم قریبی

رشتہ داروں کی چیزیں نہیں لوٹاتے۔ دُور پرے کے لوگوں کی چیزیں پھر بھی لوٹا دیتے ہیں۔ خواہ ماں سے کوئی چیز لیں، بھائی بہن یا قریبی دوست ہی سے کچھ کیوں نہ لیا ہو، ضرور واپس کرنا چاہیے۔

اصل جذبہ یہ ہونا چاہیے کہ امانت میں خیانت نہ ہو۔ اگر آپ نے عاریۃً کوئی چیز لی ہے تو اُس کو واپس کرنا آپ پر فرض ہے اور اس کے مالک کا حق ہے۔ آپ نے اپنی بیٹی سے پنسل یا قلم مانگا تو استعمال کر کے واپس کیجیے۔ اس طرح بچوں کی بھی تربیت ہوگی کہ دوسروں کی چیزوں پر قبضہ نہیں کرنا اور آپ بھی اُن کے لیے نمونہ بن جائیں گے۔

اگر کوئی آپ کے ہاں کھانا بھجوائے تو بہتر یہ ہے کہ برتن اُسی وقت دھو کر واپس کر دیں یا پھر جلد از جلد واپس کریں۔ مدّتوں اپنے گھر میں مت رکھیں اور نہ اُن کو استعمال کریں۔ ایسا نہ ہو کہ وہ ٹوٹ جائیں یا استعمال کے قابل نہ رہیں۔ امانتوں کو پوچھے بغیر استعمال نہیں کر سکتے اس کا خیال رکھا کریں۔ پاس پڑوس سے کبھی کبھار کوئی مشین بھی لے لی جاتی ہے۔ اس معاملے میں بھی احتیاط برتیں، کہیں استعمال کے دوران خراب نہ ہو جائے، اور پھر اچھی طرح صاف کر کے پہلی فرصت میں واپس کیجیے۔ یہ آپ کا فرض ہے، دوسرے کو اپنی چیز مانگنا نہ پڑے۔ اپنے بچوں میں بھی یہ عادت ڈالیں کہ کسی کی کوئی چیز بغیر اجازت کے نہ اُٹھائیں اور اگر مانگ کر، لی ہے تو لازماً واپس دیں۔

عہدے کی امانت:

اب امانت کا تعلق عہدے یا ذمہ داری یا ملازمت سے جوڑیں۔ کسی نے یہ ذمہ داری قبول کی ہے کہ میں دن کے آٹھ گھنٹے کام کروں گا تو اب اُس کو کام کرنا ہے۔ اگر وہ اس میں کمی کوتاہی کر رہا ہے تو اس امانت میں خیانت کر رہا ہے، اپنے قول (commitment) میں خیانت کر رہا ہے۔ کوئی اچانک مجبوری آ جائے کہ پورا وقت نہ دے سکے تو اطلاع ضرور دے لیکن عہد کر کے اس طرح اوقات میں اطلاع دیے بغیر کمی بیشی کرنا خیانت میں شمار ہوگا۔

مفتی صاحب نے لکھا ہے کہ دارالعلوم دیوبند کے اساتذہ کا معمول تھا کہ تدریس کے دوران اگر اُن سے کوئی دوست احباب ذاتی غرض سے ملنے آ جاتے تو وہ وقت نوٹ کر کے ملاقات کرتے اور یوں مہینے میں ایسی ذاتی مصروفیات کے اوقات کا حساب لگا کر انتظامیہ کو بھیج دیتے کہ مہینے میں اتنے گھنٹے ہم نے اپنے کاموں میں صرف کیے ہیں۔ تنخواہ سے یہ پیسے کاٹ لیے جائیں۔ یہ کوئی اساطیری قصے (fairy tales) نہیں سنائے جا رہے، بلکہ نیک لوگ امانت کا اسی قدر خیال رکھتے ہیں۔ اندازہ کریں اتنے امانت دار اور ایسے دیانت دار تھے کہ ان اوقات کی تنخواہ نہیں وصول کرتے تھے جن کو ذاتی کاموں میں خرچ کر دیا ہو۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا واقعہ آتا ہے جب وہ خلیفہ تھے تو وہ اندھیرے میں چراغ جلا کر حکومت کا

کوئی کام کر رہے تھے۔ اتنے میں اُن کے بھائی اُن سے ملنے کے لیے آ گئے، جیسے ہی وہ داخل ہوئے حضرت علی رضی اللہ عنہ نے چراغ بجھا دیا۔ اُن کے بھائی نے کہا یہ آپ نے کیوں کیا؟ اُنہوں نے جواب دیا اس لیے کہ اس چراغ میں بیت المال کا تیل جل رہا تھا اور تم ذاتی بات کرنے آئے ہو۔ اگر بیت المال کے تیل کی روشنی میں تمہارے ساتھ ذاتی گفتگو کروں گا تو خیانت ہو جائے گی۔

ایک اور واقعہ لکھتے ہیں کہ مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ دارالعلوم دیوبند کے پہلے طالب علم تھے، پھر استاذ بنے تو اُن کی تنخواہ دس روپے تھی۔ جب عمر زیادہ ہوگئی، تجربہ زیادہ ہوا تو مجلس شوریٰ نے ان کی تنخواہ بڑھانے کی تجویز دی تو دس روپے کی بجائے پندرہ روپے ماہانہ تنخواہ کر دی گئی۔ جب اُن کو دس کی جگہ پندرہ روپے تنخواہ ملی تو اُنہوں نے پوچھا یہ کیوں؟ بتایا گیا کہ مجلس شوریٰ کا فیصلہ ہے کہ آپ کی تنخواہ بڑھا دی جائے۔ آپ نے اضافی تنخواہ لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ پہلے میں جوان تھا، زیادہ وقت پڑھاتا تھا، اب بوڑھا ہو گیا ہوں، زیادہ پڑھا نہیں سکتا، کم وقت دیتا ہوں۔ اس لیے میری تنخواہ میں اضافے کا کوئی جواز نہیں۔

شاگرد کو دیے گئے نمبر بھی گواہی ہوتی ہے کہ اس نے کتنی محنت کی ہے اور کتنی تیاری کی ہے۔ کتنے نمبر اس کا حق ہیں؟ طلبہ عام طور پر شکایت کرتے ہیں کہ ہمیں کم نمبر ملے ہیں، ہمارے ساتھ زیادتی ہوئی ہے یا حساب کتاب کی غلطی ہوئی ہے۔ لیکن اگر غلطی سے نمبر زیادہ دے دیے جائیں تو کوئی نہیں بتاتا کہ مجھے غلطی سے زیادہ نمبر مل گئے ہیں، ان کو کم کر دیا جائے۔ شاگرد کو چاہیے کہ وہ احساس کرے کہ اگر میں نے یہ غلطی پوشیدہ رکھی تو خیانت ہو جائے گی۔ ان نمبروں پر میرا حق نہیں بنتا۔ اس کو ان نمبروں کو واپس کرنا چاہیے، ورنہ خیانت کا مرتکب ہو جائے گا۔

آج حال یہ ہے کہ کہیں مفت فون کرنے کو مل جائے یا کسی آفس میں فون کی سہولت ہو تو فوراً جگہ جگہ فون کرنا شروع کر دیں گے۔ دفتروں میں خاص طور پر اہل کار اور افسران لمبی لمبی کالیں کر کے ادارے کا وقت اور پیسا ضائع کر کے خیانت کا ارتکاب کرتے ہیں۔ اور کان پر جوں تک نہیں رینگتی کہ دفتر کی چیزیں ذاتی کاموں کے لیے استعمال نہیں کرنا چاہیے۔

سورۃ الانفال میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے:

{يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَخُونُوا اللهَ وَالرَّسُولَ وَتَخُونُوا أَمَانَاتِكُمْ}

(الانفال:۲۷)

''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو تم اللہ اور رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے خیانت مت کرو اور تم اپنی امانتوں میں بھی خیانت مت کرو۔''

خیانت کے جواب میں خیانت جائز نہیں:

اگر ایک شخص خیانت کرتا ہے تو اُس کے ساتھ کیا رویہ کرنا چاہیے، اس بارے میں نبی

اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:

((وَلَا تَخُنْ مَنْ خَانَکَ))(۱)

''جو تمہارے ساتھ خیانت کرے، اُس کے ساتھ خیانت مت کرو۔''

اور یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے عملی طور پر کر کے دکھایا۔ غزوہ خیبر کا واقعہ ہے، یہودی بڑے طاقت ور تھے۔ اپنے قلعوں کے اندر بند ہو کر بیٹھ گئے تھے اور مسلمانوں نے اُن کا محاصرہ کیا ہوا تھا، حالت جنگ تھی اور حالت جنگ میں دشمن کا سارا مال حلال ہوتا ہے۔ واقعہ آتا ہے کہ ایک چرواہا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا، یہودیوں کی بکریوں کا ریوڑ چرا رہا تھا، اُس نے اسلام قبول کر لیا اور کہا ''آپ صلی اللہ علیہ وسلم مجھے حکم دیجیے میں کیا کروں'' آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اس وقت اللہ کی راہ میں جہاد ہو رہا ہے، اس میں حصہ لے لو'' اس نے کہا ٹھیک ہے۔ مگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ''یہ بکریاں تمہارے پاس یہودی کی ہیں، ان کو واپس کر دو پھر تم آنا، وہ گیا بکریاں واپس کیں، دوبارہ آیا، جنگ میں حصہ لیا اور لڑتا ہوا اللہ کی راہ میں شہید ہوا'' اس نے ایک وقت کی نماز بھی نہ پڑھی، صرف کلمہ شہادت پڑھ کر مسلمان ہونے کا اعلان کیا تھا۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں اس کو جنت الفردوس میں دیکھ رہا ہوں۔'' صرف ایک عمل شہادت سے پہلے کر گیا اور وہ تھا امانت کی واپسی!! اور پھر شہادت کا رتبہ بھی ملا۔ دیکھیے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امانت کا کتنا خیال رکھا۔ جنگ ہو رہی تھی اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے امانت کا مال واپس کروایا۔ حالاں کہ یہودی دشمن تھے، وہ تو قدم قدم پر رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خیانت کا معاملہ کر چکے تھے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سبق نہ دیا کہ چوں کہ وہ خیانت کرتے رہے ہیں ہمارے ساتھ تو ہم بھی خیانت کریں اور اُن کے مویشی رکھ لیں۔ تو یہ دھوکا دینا، خیانت کرنا، یہ مسلمانوں کی شان نہیں۔

مریض کی بات امانت:

اسی طرح کوئی مریض اپنی کیفیت یا مرض کسی ڈاکٹر کو بتاتا ہے تو اُس کی بات ڈاکٹر کے پاس امانت ہے۔ اُس کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اس کے مرض کا تذکرہ ہر آنے والے کے ساتھ کرے، خود تک محدود رکھنا چاہیے۔

اسی طرح اگر کوئی آپ کو کوئی بات بتاتا ہے اور یہ بھی تاکید کرتا ہے کہ اسے پوشیدہ رکھیے گا۔ پھر اگر آپ کسی سے اس کا ذکر کرنا چاہ رہے ہیں تو پہلے اجازت لے لیں، پوچھ لیں کہ کیا میں دوسروں سے مشورہ لے سکتا ہوں۔ اگر اجازت دے تو پھر دوسرے سے راہ نمائی لیں ورنہ آپ کے پاس اختیار نہیں ہے کہ کسی کے سامنے اس کا تذکرہ کریں، یہ آپ کے پاس امانت ہے۔ بعض خواتین اپنے شوہروں کو اپنا ہی حصہ سمجھتی ہیں، یعنی جو مجھے پتا ہے، وہ میرے شوہر کو بھی پتا ہونا چاہیے۔ یہ تو ایک ہی

---

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب البیوع، باب فی الرجل یأخذ حقہ۔

بات ہے اور بلا جھجک دوسروں کی کہی ہوئی باتیں اپنے شوہروں کو بتا دیتی ہیں۔ یہ خیانت ہے، گناہ ہے۔ عورت کو چاہیے کہ شوہر کو بتانے سے پہلے جس کی بات ہے، اس سے اجازت لے۔ یاد رکھیں تمام راز امانت ہوتے ہیں، کسی اور کو اُن کے بارے میں بتانا خیانت ہے۔

خیانت پر خیانت:

ہمارے معاشرے کی ایک خامی یہ ہے کہ مثلاً ایک خاتون دوسری سے رازداری میں کہتی ہے کہ یہ بات فلاں نے مجھے بتائی ہے مگر تم کسی کو مت بتانا، تیسری خاتون اگلی سے بھی یہی تقاضا کرتی ہے اور بتا دیتی ہے، اس طرح ایک زنجیر (chain) بن جاتی ہے، ایک سلسلہ چل پڑتا ہے۔ خواتین کو چاہیے کہ اپنے تجسس (curiosity) پر قابو رکھیں اور دوسروں کو بھی اگر کوئی راز افشا کرتے سنیں تو منع کر دیں کہ یہ خیانت ہے۔ دوسروں کی اصلاح کریں اور ان کی مدد کریں۔ کوئی آپ کو کسی کا راز بتانا چاہے تو منع کر دیں اور اگر آپ خود کسی کے بارے میں کسی سے پوچھ رہے ہیں اور وہ کہہ دیتا ہے کہ اس نے بتانے سے منع کیا ہے تو اصرار نہ کریں، مزید کھود کرید نہ کریں۔

کسی کا فون اور چھپی بات سننا خیانت ہے:

اس طرح ٹیلی فون پر دوسروں کی گفتگو سننا خیانت ہے۔ انگریزی میں کہاوت ہے:

"Ears droppers never hear good about themselves"

''جو چھپ چھپ کر دوسروں کی گفتگو سنتے ہیں، اپنے بارے میں کوئی خیر نہیں سنتے۔''

اگر گھر میں یا دفتر میں ٹیلی فون کا ایکسٹینشن ہے تو کبھی بھی جان بوجھ کر دوسرے سیٹ سے دوسروں کی باتیں مت سنیں، اگر کبھی فون اٹھایا اور پتا چلا کہ پہلے سے بات چل رہی ہے تو فوراً اپنی طرف والا سیٹ رکھ دیں، چھپ کر سننا تعلقات کے لیے بھی بُرا ہے اور گناہ تو ہے ہی۔ حدیث مبارکہ میں بھی اس کا ذکر آتا ہے کہ اگر کسی شخص نے کسی کے خط پر نظر دوڑائی، اس نے آگ میں جھانکا۔ کسی کی نجی گفتگو سننے کی اتنی ممانعت ہے۔

اسی طرح آپ ﷺ کا یہ ارشاد ہے: ''مجلسیں امانت ہوتی ہیں۔'' مجلس میں جو بات کی گئی ہوتی ہے، وہ بھی امانت ہوتی ہے، اب یہ نہ ہو کہ مجلس میں کوئی بات سنی اور اُس میں تھوڑا بہت سچ جھوٹ ملا کر سیاق و سباق سے کاٹ کر دوسروں کے سامنے بتانا شروع کر دیا۔ یہ امانت میں خیانت بھی ہے اور جھوٹ ملانے کا گناہ بھی، اس لیے ان چیزوں کے بارے میں بہت ہی محتاط رہنا چاہیے۔

دھوکا اور خیانت:

جہاں تک دھوکے کا تعلق ہے، یہ تو ہمارے معاشرے میں بہت عام ہے۔ کتنی ہی چیزوں میں دھوکا دیا جاتا ہے۔ یہ بھی خیانت ہی کی ایک قسم ہے۔ دھوکا اب ہمارا مزاج بن گیا ہے۔ یہ بُرائی ہی

نہیں رہی۔ درزی بچا ہوا کپڑا رکھ لیتا ہے اور یہ گمان بھی نہیں کرتا کہ وہ خیانت کر رہا ہے، یہ گناہ ہے ۔یہ کپڑا کسی کی امانت تھی یا بیل (lace) لگوانے دی اور آپ نے ضرورت سے زیادہ دے دی لیکن جو بچ گئی وہ واپس نہ ملی۔ افسوس ناک بات یہ ہے کہ آج کل دواؤں کے اندر بھی ملاوٹ اور دھوکا عام ہے۔ تعمیرات میں ٹھیکے دار دھوکا کرتے ہیں، صحیح مال نہیں لگاتے یا کم لگاتے ہیں۔ مشروبات میں ملاوٹ، مصالحوں میں ملاوٹ، دودھ دہی میں ملاوٹ، گوشت کو دھودھو کر وزن بڑھاتے ہیں اور جانور کے اندر پانی انجیکٹ کرتے ہیں۔ بے ایمانی اتنی عام ہوگئی ہے کہ بے ایمانی اور ایمان داری کا فرق ہی لغو ہو گیا ہے۔ اور کہیں کہیں تو بے ایمانی اور دھوکے بازی ذہانت کی علامت بن گئی ہے۔ اسکولوں اور کالجوں میں تو یہ عام ہے۔ یہ علم کی خیانت ہے، ایسی تعلیم کا کوئی اجر کوئی ثواب نہیں۔ بے ایمانی سے حاصل شدہ علم سے آگے چل کر کیا حلال رزق کمائیں گے اور ایمان کی زندگی کیوں کر گزاریں گے۔

اسی طرح اشتہارات ہی دیکھ لیں۔ کس قدر جھوٹ، مبالغہ آرائی اور دھوکا دہی پر مبنی ہوتے ہیں۔ اس پر مستزاد یہ کہ قانونی طور پر اس جھوٹ کے پلندے پر گرفت بھی ممکن نہیں ہے، آپ اگر اشتہاری دعووں کو غلط بھی ثابت کر دیں تو کمپنی کا بال بھی بیکا نہ ہوگا۔ اور جو لوگ اس اشتہار میں اداکاری کرتے ہیں وہ بھی جھوٹ کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اس طرح اتنے بڑے پیمانے پر جھوٹ کو عمدہ بنا کر انسانوں کو خریداری کا حریص بنایا جاتا ہے۔

وعدہ اور خیانت:

''وعدے'' کو مفتی محمد تقی عثمانی صاحب نے عمومی طور پر لیا ہے اور بہت ساری باتوں کو وعدے کے ذیل میں لائے ہیں۔ مثلاً عہدہ تو وعدہ ہے ہی اور زبان (commitment) دینا بھی وعدہ ہے۔ پھر اگر کسی جگہ کا ویزا (visa) لیتے ہیں تو یہ بھی وعدہ ہے۔ یعنی آپ وعدہ کرتے ہیں کہ اس ملک کے قوانین کی خلاف ورزی نہیں کریں گے۔ جب آپ کسی ہوائی جہاز کا ٹکٹ لیتے ہیں تو اس کی شرائط کے پابند ہوتے ہیں۔ اگر ان شرائط کو نہ مانا تو یہ بھی وعدہ خلافی ہو جائے گی۔ لہٰذا ایسی چیزیں مت لے کر جائیں جو کہ ممنوع ہو۔ مگر ہم یہاں بھی دھوکا کرتے ہیں۔ جو چیزیں ان ممالک میں لے جانا منع ہے وہ چھپا چھپا کر لے جاتے ہیں، پان یا کوئی اور مصالحہ جات جو باہر نہیں ملتے اُن کو چھپا کر ساتھ لے جانا کہ کسٹم والے نہ دیکھ سکیں، یہ بھی دھوکا دینا ہے۔ ذرا سوچیں کہ قیامت کے دن ہم اپنے اعمال کس طرح چھپائیں گے، لوگ یہ بھول جاتے ہیں کہ وہ انسانوں کی نظر سے خواہ بچ بھی جائیں مگر اللہ کی نظر سے نہیں بچ سکتے۔ یہ گناہ ہے، چوری ہے اور دھوکا ہے۔

پھر ہوائی سفر میں ایک خاص حد تک سامان لے جانے کی اجازت ہوتی ہے لیکن ہمارے لوگ باہر ملکوں سے واپسی پر ایسی شاپنگ کرتے ہیں، جیسے پاکستان میں کچھ ملتا ہی نہیں۔ اور جب زائد سامان جہاز والے روکتے ہیں تو انھیں بُرا بھلا کہتے ہیں۔ اس میں بھی امانت کا خیال رکھنا ہے۔ اسی طرح جتنی مدت کا ویزا لیا ہے، اتنے ہی عرصہ رکیں۔ مثلاً لوگ عمرے کا ویزا لے کر سعودی عرب جاتے ہیں اور سوچتے ہیں کہ چلو حج تک رہ لیں گے۔ ویزا خود ایک عہد اور امانت ہے، عمرے کے ویزے پر حج کرنا تو زیادتی ہے۔

اسی طرح اگر کسی ملک کی شہریت لی ہے اور وہاں کے کچھ قوانین دین کے خلاف ہیں تو شہریت ترک کر دیں یا مسافر بن کے رہیں۔ ایسے ممالک میں بسنا اور ان کے قوانین کو نہ ماننا کہاں کا انصاف ہے؟ یہ نہیں ہوسکتا کہ کسی ملک کی قومیت تو شوق سے لے لیں، شہری ہونے کے ناتے سارے فوائد بھی اُٹھائیں مگر انکم ٹیکس ادا نہ کریں کہ یہ تو دشمن ملک ہے، ہم کیوں ان کو فائدہ پہنچائیں۔ یہ عجیب دوہری منطق (twisted logic) ہے۔ کچھ مسلمانوں کا ان ممالک میں سب سے بڑا جہاد یہی ہے۔ یاد رکھیں یہ کوئی جہاد نہیں ہے، یہ سراسر خیانت اور وعدہ خلافی ہے۔ جس ملک کے جو قوانین ہیں، وہ آپ کو ضرور ماننے ہیں۔ یہاں تک کہ سڑک کے قوانین کو بھی ماننا لازمی ہے۔ اس لیے کہ ہم نے وعدہ کیا ہے کہ ہم یہاں کے شہری ہیں اور یہاں کے قوانین پر عمل کریں گے۔

آج کل معاشرے سے بھروسہ بالکل ختم ہوگیا ہے، اعتبار اُٹھ گیا ہے، ہر آن دھڑکا لگا رہتا ہے۔ مثلاً مزدور نے پیسے تو پورے لے لیے ہیں، پتا نہیں کام ٹھیک سے کرے گا یا نہیں۔ دکان دار نے سامان صحیح تول کر دیا، یا نہیں۔ اصل چیز خرید رہے ہیں یا نہیں۔ اگر دکان دار نے تولتے وقت پیاز کی ڈلی بچالی تو کیا کیا اُس نے؟ اس ڈلی کی وجہ سے اُس کا سارا مال مذموم اور مشکوک ہوگیا۔ معاشرے میں اعتماد کی فضا خراب کی، خیانت کی۔ یہ بھی ایک طرح کا معاشروں پر عذاب ہے کہ اُن میں سے امانت اُٹھ جائے۔ ابھی ہم نے امانت دار تاجر کا مقام پڑھا کہ وہ قیامت کے دن انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کے درمیان ہوگا، جو بے ایمانی نہیں کرتا، وعدہ خلافی نہیں کرتا، خیانت نہیں کرتا۔

ہم عام طور بچوں سے کیے ہوئے وعدے کو وعدہ ہی نہیں سمجھتے اور اس وعدے کو کبھی نہیں نبھاتے۔ بلکہ یہ ایک معمولی چیز سمجھی جاتی ہے۔ اس طرح بچوں کے دلوں میں شروع ہی سے وعدہ پورا کرنے کی اہمیت ختم ہوجاتی ہے۔ جھوٹ بولنے کی عادت بھی انھیں بڑوں سے پڑتی ہے۔ اور امانت میں بے احتیاطی بھی بچے اپنے بڑوں ہی سے سیکھتے ہیں۔ عموماً بڑے بچوں سے چیزیں لے کر واپس نہیں کرتے، چناں چہ امانت کی اہمیت اُن کے سامنے نہیں آپاتی۔

امانت کے مختلف مواقع:

امانت کا مفہوم ذہن میں رکھنا چاہیے۔ کسی پر کسی معاملے میں بھروسا کرنا امانت ہے۔ ہاں اگر کوئی بات ہو رہی ہے اور آپ سے کسی نے راز میں رکھنے کو نہیں کہا تو پھر آپ کو اختیار ہے۔ یہاں آپ نے صرف اس بات کا خیال رکھنا ہوگا کہ سیاق و سباق سے علاحدہ کر کے بات بیان نہ کی جائے۔ اپنے محلِ وقوع میں رکھ کر بات بتائی جائے اور اُس کے اندر غیبت بھی نہ ہو اور اپنی طرف سے کوئی جوڑ توڑ نہ ہو، کسی کی بدنامی یا بے عزتی مقصود نہ ہو۔

مثال کے طور پر کسی کا چھپا ہوا عیب دیکھ لیا اور دیکھنے والے کو کسی نے پابند بھی نہیں کیا کہ اس عیب کو پوشیدہ رکھنا۔ تو یہ ہماری اخلاقی حس بتائے گی کہ ہم یہ عیب اوروں کے سامنے بیان کرتے ہیں یا نہیں، اس بات کا بھی خاص خیال رکھنا چاہیے۔ یہ تصور کریں کہ اگر میری کوئی ایسی ویسی بات دوسروں کو جا کر کوئی بتائے تو مجھے کیسا لگے۔ کیا مجھے دھوکے (betrayal) کا احساس نہیں ہوگا کہ اس نے میری لاج نہیں رکھی۔ اگر ہمیں اپنے بارے میں یہ احساس ہو رہا ہے کہ فلاں کو مجھے بے آبرو نہیں کرنا چاہیے تھا تو خود بھی کسی کا عیب دیکھ کر آگے نہ بتائیں۔ بعض اوقات کوئی لفظوں میں آپ سے نہیں کہتا کہ یہ بات آگے مت کہنا بلکہ یہ مضمر (understood) ہوتی ہے۔ اب مریض تو ڈاکٹر سے نہیں کہتا کہ میرے اس مرض کے بارے میں کسی کو مت بتائیں۔ ڈاکٹر کو خود اس بات کا احساس ہونا چاہیے کہ میں مریض کی بیماری کا کسی سے ذکر نہ کروں۔

اسی طرح میت کو غسل دیتے ہوئے کوئی جسمانی عیب نظر آ گیا تو کسی کو نہ بتایا جائے۔ یہ خیانت ہو جائے گی۔ کیا ہم چاہیں گے کہ مرنے کے بعد ہمارا کوئی عیب کسی کو بتایا جائے۔ یہ ایک بہت آسان سا معیار ہے کہ جو چیز ہمیں اپنے لیے پسند نہیں، وہ دوسروں کے لیے بھی پسند نہیں کرنا چاہیے۔

بعض اوقات سیاق و سباق کے بغیر بات کی جائے تو اس کا مفہوم ہی بدل جاتا ہے۔ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو دورانِ گفتگو ہوتی ہیں اور جس مقام و محل پر گفتگو پہنچی ہوتی ہے اس جگہ کوئی خاص جملہ بالکل مناسب ہوتا ہے۔ لیکن اگر صرف وہ جملہ اُچک کر کسی اور کے سامنے بیان کر دیں تو اُس کا رنگ ہی بدل جائے گا۔ یہ بدترین خیانت ہے کہ آپ نے کسی کی بات کو یوں پیش کیا۔ ہوسکتا ہے دورانِ درس ایک بات ہو رہی ہو تو وہ انتہائی سنجیدہ، بامعنی اور اہم لگ رہی ہو۔ لیکن اس ساری بات میں سے ایک جملہ اُٹھا کر کسی کے سامنے، بچوں کے سامنے یا والدین کے سامنے بیان کرنے سے ہوسکتا ہے، اس بات کا حق ادا نہ ہو سکے بلکہ الٹا اس کا مذاق بن جائے، لوگ کہیں کیا حماقت کی بات ہے۔ اور ایسا عموماً ہوتا ہے۔ اس طرح سے پیش کی گئی بات اپنا وقار کھو بیٹھتی ہے۔

مشورے کی امانت:

مشورے کے بارے میں بھی احادیث مبارکہ میں آتا ہے کہ یہ بھی امانت ہے:

((اَلْمُسْتَشَارُ مُؤْتَمَنٌ))(۱)

''مشورہ دینے والا امین ہوتا ہے۔''

دوسروں کو ایسا مشورہ دیں، جیسا آپ اپنے لیے پسند کرتے ہیں، یہ امانت ہے۔ دوسروں کو ایسا مشورہ نہ دیں کہ اُن کو نقصان پہنچے یا اُن کے ساتھ زیادتی ہو جائے، مثلاً کسی بات کے بارے میں آپ کو پتا ہی نہ ہو لیکن آپ پھر بھی مشورہ دینے کے لیے تیار ہو جائیں یا اپنے مفادات کی حفاظت کے لیے دوسروں کو مشورہ دیں۔ مشورہ دراصل امانت ہے۔ دیکھیں ایک شخص آپ پر بھروسا کر کے آپ سے راہ نمائی کی درخواست کرتا ہے کہ آپ اُسے بہترین مشورہ دیں گے۔ کسی کے اعتماد کو ٹھیس پہنچانا بھی خیانت ہے، امانت کا مفہوم ذہن میں وسیع رکھیں، تو اگر آپ نے پُرخلوص مشورہ نہ دیا تو خیانت کی۔ بعض رشتے ایسے ہوتے ہیں کہ اگر ان میں سے کسی نے آپ سے مشورہ مانگا اور انسان کو یہ محسوس ہوا کہ اگر میں نے اس کے فائدے کا مشورہ دے دیا، اس کو صحیح مشورہ دیا تو اس کا فائدہ ہوگا اور میرا نقصان ہو جائے گا تو بعض دفعہ انسان مشورہ دیتے وقت سامنے والے کا فائدہ دیکھنے کی بجائے، اپنا فائدہ دیکھتے ہوئے اس کو مشورہ دیتا ہے، یہ خیانت ہے۔ مشورہ مانگنے والے کا فائدہ ملحوظ رکھنا چاہیے۔ دوسری بات یہ کہ مشورے کو مشورے کی طرح دیا جائے، حکم کی طرح نہیں اور یہ توقع کرنا کہ اب وہ ضرور میرے مشورے کو مانے گا اور اگر وہ نہ مانے تو ناراض ہونا۔ پھر تو یہ حکم ہوا مشورہ تو نہ ہوا۔ مشورہ کے اندر تو اختیار (choice) ہوتا ہے کہ وہ آپ کی بات قبول کرنا چاہے یا نہ کرنا چاہے۔

دفتر کے متعلق امانت:

دفتر میں جیسا کہ عام طور پر کاغذ، پنسل، فوٹو اسٹیٹ مشین، ٹیلی فون اور دیگر کئی چیزیں ہوتی ہیں۔ تو دفتر کی چیزوں کو صرف دفتری امور ہی کے لیے استعمال کرنا چاہیے۔ آفس کے قلم اور دیگر سامان ذاتی کاموں میں استعمال نہیں کرنا چاہیے۔ یہ بھی خیانت ہے۔ معاشی معاملات میں خیانت، گھر والوں اور بچوں کے ساتھ بڑی زیادتی ہے کہ اُن پر خیانت سے کمایا ہوا مال خرچ کیا جائے۔ یا آفس نے آپ کو یہ سہولت دی ہوئی ہے کہ کاروباری حکمت عملی کے لیے آپ کسی کو کھانا کھلا سکتے ہیں،

(۱) سنن ابی داؤد، کتاب الأدب، باب فی المشورہ

اپنے گاہک کو یا کسی خاص آدمی کو اور اس کا خرچہ کمپنی اُٹھائے گی۔ اب آپ اس سہولت کو اپنے گھر والوں پر استعمال کریں، اپنے بیوی بچوں کو کھانا کھلانے لے جائیں تو یہ غلط ہے۔

یا آفس نے آپ کو صرف دفتری کام کے لیے کار کی سہولت (facility) دی ہوئی ہے تو اُسے بغیر اجازت ذاتی کاموں میں مت استعمال کریں۔ لیکن اگر آپ کے ملازمتی معاہدے (service contract) میں یہ تمام سہولیات ذاتی استعمال کرنے کی اجازت ہے تو ذاتی استعمال کے لیے بھی گاڑی، ڈرائیور، پٹرول اور ٹیلی فون وغیرہ استعمال کر سکتے ہیں۔ لیکن یہ بھی ایک حد کے اندر اندر ہونا چاہیے یہ نہیں کہ پورے پاکستان دفتر کی گاڑی میں گھوم پھر رہے ہیں۔ صرف دفتری کام اور شہر کے اندر گھریلو ضروریات تک ہی استعمال رہنا چاہیے۔

کمپنی کی رعایت میں خیانت:

اسی طرح بعض کمپنیوں کی طرف سے (free medical) بھی ملتا ہے۔ ڈاکٹر کی فیس، دوائی، آپریشن کا خرچ وغیرہ۔ اس میں بھی بعض لوگ بہت ناجائز چیزیں شامل کر دیتے ہیں۔ بچوں کے دودھ کے ڈبے، کاسمیٹک دوائیاں وغیرہ یہ سب ناجائز ہے۔ کمپنی ان چیزوں کی ذمہ دار نہیں اور نہ ہی یہ علاج معالجے کی مد میں آتی ہیں۔ یہ بہت بڑی خیانت ہے، بے ایمانی ہے، امانت میں خیانت ہے۔ بعض لوگ کسی اور کا علاج کروا کے بل اُس کے نام کا بنوا دیتے ہیں جس کو کمپنی نے سہولت دے رکھی ہے۔ مثلاً بیٹی ماں سے کہے کہ آپ علاج کروالیں اور بل میرے نام سے بنوالیں جو کمپنی ادا کر دے گی۔ یہ خیانت کی بڑی مثال ہے۔

جہاز کی چیزوں میں خیانت:

بعض لوگ ہوائی جہاز سے اترتے ہوئے بیت الخلاء (wash rooms) کی معمولی چیزیں اٹھا لیتے ہیں، بلکہ بعض تو کمبل اور تکیے تک اپنے ہینڈ بیگ میں ٹھونس لیتے ہیں۔ کھانے کے بعد کانٹے اور چمچے اپنے ساتھ لے آتے ہیں۔ یہ سب معمولی چیزیں ہیں مگر خیانت اور چوری کا گناہ وہی ہے۔ ان دونوں میں بال برابر فرق نہیں۔ ان حقیر اور معمولی چیزوں کے لیے انسان اپنا گراں مایہ ایمان گنوا بیٹھتا ہے۔ یہ مومن کے لیے کسی طور پر مناسب نہیں ہے۔

نبی اکرم ﷺ نے فرمایا:

((مَنْ اقْتَطَعَ حَقَّ امْرِئٍ مُسْلِمٍ بِيَمِينِهِ فَقَدْ أَوْجَبَ اللهُ لَهُ النَّارَ وَحَرَّمَ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ فَقَالَ لَهُ رَجُلٌ وَإِنْ كَانَ شَيْئًا يَسِيرًا يَا رَسُولَ اللهِ قَالَ وَإِنْ قَضِيبًا مِنْ أَرَاكٍ)) (۱)

(۱) صحیح مسلم کتاب الایمان، باب وعید من اقتطع حق مسلم

''اگر کسی نے ذرہ برابر بھی کسی کی چیز لی ہے تو قیامت کے دن وہ جنت میں داخل نہ ہو سکے گا'' صحابہ رضی اللہ عنہم میں سے کسی نے پوچھا'' کہ کوئی معمولی سی چیز بھی، آپ ﷺ نے فرمایا پیلو کی ایک ٹہنی بھی۔''

درخت کی شاخ (branch) نہیں بلکہ چھوٹی سی ٹہنی (twig) بھی کسی کی بغیر پوچھے لی ہے یا دھوکا دے کر لی ہے تو وہ جنت میں داخل نہ ہوگا۔ مومن کو اپنی شایان شان زندگی گزارنا چاہیے، غنی ہو کر زندگی گزارنا چاہیے۔ ان چھوٹی چھوٹی چیزوں کے لالچ میں نہ آئیں۔ چوری تو دُور کی بات ہے یہ جو ہوٹلوں کے کمروں میں چھوٹی موٹی چیزیں رکھی ہوتی ہیں، وہ اس لیے ہوتی ہیں کہ یہ چیزیں دورانِ قیام استعمال کی جائیں گی، انھیں سمیٹ کر گھر لے آنا بہت ہی گھٹیا حرکت ہے۔ خیانت کے علاوہ اس سے حرص و ہوس بھی ٹپکتی ہے۔

اسی طرح ہوٹل میں بہت سارے کاغذی رومال (tissue papers) لا کر رکھ دیے جاتے ہیں، نمک اور کالی مرچ وغیرہ رکھی جاتی ہیں۔ اب اگر کسی کے دل میں یہ آئے کہ نمک مرچیں تو کسی وقت کام آسکتی ہیں اور رومال بھی وقت بے وقت کام آجاتے ہیں، اس لیے وہ ساری چیزیں بیگ میں رکھ لیں، یہ انتہائی غیر مناسب بات ہے۔ اُنہوں نے یہ سب سامان اس لیے دیا تھا کہ یہ آپ اُسی مقام پر استعمال کریں گے، گھر لے جانے کو نہیں دیا تھا، یہ خیانت بھی ہے اور کریہہ النظر بھی ہے۔

یا پھر آپ کسی ایسے ہوٹل میں گئے، جہاں ایک خاص رقم ادا کرنے کے بعد جتنا مرضی کھا سکتے ہیں، کوئی پابندی نہیں ہے۔ ان کا بھروسا اور امید یہ ہے کہ جتنا آپ کو کھانا ہوگا، آپ اُتنا ہی نکالیں گے۔ اُنہوں نے یہ نہیں سوچا ہوگا کہ آپ کھانا ضائع کریں گے۔ یہ بھی ایک طرح کی خیانت ہے۔ اسراف میں تو یہ یقینا آجاتا ہے جو کہ سخت ناپسند ہے، بہت گری ہوئی حرکت ہے، لالچ اور حرص کا اظہار ہے، ساتھ ساتھ رزق کی بے حرمتی اور سخت ناقدری بھی ہے۔ شادی بیاہ وغیرہ میں بھی اس طرح کتنا ہی کھانا ضائع ہوتا ہے۔

پبلک مقامات وغیرہ کی خیانت:

حکومت اگر کوئی آرام گاہ یا باغ بناتی ہے تو ہماری سہولت کے لیے بناتی ہے۔ آپ ان جگہوں کو امانت سمجھ کر استعمال کریں۔ کچرا نہ پھینکیں، چیزیں مت توڑیں، بچوں کے جھولوں پر بڑے بیٹھ کر اُن کا ستیاناس نہ کریں، جھاڑیاں اور پھول بھی امانت ہیں۔ یہ سب کسی اور کی ملکیت ہیں۔ وہاں سے پھول توڑنا خیانت ہے، پودے اور پھول مت توڑیں، بعض لوگ چلتے چلتے چھڑی سے پودوں کو مارتے چلے جاتے ہیں، چلتے چلتے راستے کے قریب پودوں کے پتے نوچتے چلے

جاتے ہیں، یہ خواہ مخواہ چیزوں کو خراب کرنا ہے۔

ایک دفعہ ایک پاکستانی جاپان گیا اور ایک ریل گاڑی میں سفر کیا۔ وہاں کی ریل گاڑیاں بہت آرام دہ (luxurious) ہوتی ہیں اور بہت ہم وار (smoothly) چلتی ہیں۔ ساتھ میں ایک جاپانی مسافر بھی بیٹھا تھا اور کافی پی رہا تھا۔ اتفاقاً کچھ ہلکا سا جھٹکا لگا تو کافی کے چند قطرے نیچے گر گئے۔ یہ جاپانی اُٹھا، اپنی کافی کا کپ کافی ہولڈر میں رکھا، ایک گیلا tissue لے کر آیا اور قالین کو رگڑ کر صاف کیا، کافی کا داغ مٹا دیا۔ جن اقوام کو امانت کا شعور ہوتا ہے وہ قومیں ترقی کرتی ہیں۔ ہمارے ہاں تو سرکاری املاک کی حفاظت اور امانت کا تصور بھی نہیں پایا جاتا کہ ہمارے لوگ پاکستان میں اس طرح سرکاری املاک (public property) کا خیال رکھیں۔

گھریلو مکالمات میں خیانت:

فرض کریں آپ کے کسی دوست کے بیٹے نے آپ کے بیٹے کو ایک دن اپنے گھر پر گزارنے کی دعوت دی۔ آپ نے اپنے بیٹے کو بھیج دیا، جب بیٹا واپس آیا اور آپ نے اُس سے پوچھنا شروع کیا، بتاؤ وہاں کیا کیا ہوتا ہے، کیا کھایا، کیا باتیں ہوئیں، یہ کیسے ہوا وہ کیسے ہوا وغیرہ یہ مناسب نہیں، یہ بھی خیانت ہے۔ بچوں سے اس طرح جاسوسی مت کروائیں۔ ہاں یہ پوچھ سکتے ہیں کہ تم نے سارا دن کیا کیا، کیا کھیل کھیلے، یہ ضرور معلوم کرنا چاہیے کہ کہیں آپ کا بچہ کسی غلط کام میں مشغول تو نہیں رہا۔ اس نیت سے پوچھنا تو ٹھیک ہے لیکن یہ پوچھنا کہ گھر میں کیا ہو رہا تھا؟ گھر میں کون کون رہتا ہے؟ نوکر چاکر ہیں؟ دادا دادی رہتے ہیں، عورتیں پردہ کرتی ہیں یا نہیں؟ نوکروں کے سامنے بغیر نقاب کے آتی ہیں یا نہیں؟ اور اُس معلومات کی بنا پر نفاق کا فیصلہ بھی صادر کر دیا کہ دیکھا! سب منافق ہیں۔ اور پھر بے رخی اختیار کر لی، خود تعلقات بگاڑ لیے اور تجسس کر کے گناہ گار بھی بنے۔ ایسے سوالات انتہائی غیر مناسب ہیں۔ اپنے بچوں سے اُن کے دوستوں کے گھریلو معاملات کے بارے میں کھوج لگانا، یہ اچھی چیز نہیں۔

اب ایک خاتون ہے جو کہ پردہ اور حجاب کی پابند ہے۔ وہ کیوں پردہ کرتی ہے؟ اس لیے کہ وہ اپنی زینت چھپانا چاہتی ہے، اپنا چہرہ چھپاتی ہے، اپنا جسم چھپانا چاہتی ہے، وہ نہیں چاہتی کہ اُس کے بارے میں کسی غیر مرد کو پتا چلے۔ اب اگر کسی غیر مرد کے سامنے جا کر اُس خاتون کا حلیہ، روپ رنگ، ناک نقشہ، ڈیل ڈول وغیرہ سب بتا دیا جائے۔ تو اس کا پردہ تو زائل ہو گیا نا!

میاں بیوی کے متعلق ضروری بات:

ایک بات یہاں بیان کرنا ضروری ہے کہ عورت کبھی شوہر کے سامنے غیر عورت کے حسن کی

تعریف نہ کرے۔ باپردہ عورت کی تو کبھی بھی نہ کرے۔ یہ تو خیانت کا بھی ارتکاب ہے اور اپنے شوہر کو بھی جو اس کا نامحرم تھا، فتنے میں مبتلا کرنے کا باعث ہے۔ ان باتوں کا بہت خیال رکھنا چاہیے۔

اسی طرح شوہر کے رازوں کی حفاظت بھی امانت سمجھ کر کرنی چاہیے۔ قرآن میں آیا ہے کہ:

{حَافِظَاتٌ لِلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ} (النساء: ۳۴)

''وہ شوہر کے رازوں کی حفاظت کرنے والیاں ہوتی ہیں۔''

شوہر کے ساتھ جو بھی معاملات ہیں، شوہر کے راز، اُس کی عزت اور گھر بار وغیرہ امانت ہیں۔ اُن میں دوسروں کو شریک نہیں کیا جاسکتا۔ یا بعض دفعہ شوہر اپنی کم زوریاں، اپنے خدشات یا شکوے شکایات بیوی سے کرتا ہے، ان کو اوروں تک پہنچانا سخت خیانت ہے۔

کرائے کے گھروں کی خیانت:

کرائے کے گھروں پر قبضہ کر کے بیٹھ جانا، کسی صورت خالی نہ کرنا، مالک مکان کو تنگ کرنا یہ تو سو فی صد خیانت ہے۔ کیوں کہ گھر امانت کے طور پر کرائے پر دیا جاتا ہے اور مالک مکان معاہدہ کرتا ہے کہ جب ہم مکان خالی کرنے کو کہیں تو آپ دو تین مہینے میں خالی کر دیں گے۔ اگر آپ اس معاہدے کی پاس داری نہیں کرتے تو یہ سو فی صد خیانت ہے۔

بجلی میں خیانت:

بجلی کی چوری بھی سراسر خیانت ہے۔ بجلی کا میٹر بند کرنا یا پھر وہ کارندہ جو ہر مہینے بجلی کا میٹر چیک کرنے آتا ہے اُس کو ہزار پانچ سو روپے ماہ وار دے کر من مرضی کا بل بنوانا۔ یہ حکومت کے ساتھ خیانت ہے۔ اس طرح یہ خیانت بدترین چوری بھی بن جاتی ہے۔

کیا بچوں پر نظر رکھنا خیانت ہے؟

کسی کے نجی خطوط پڑھنے کی ممانعت کے بارے میں احادیث میں آیا ہے کہ کسی کے خط پر نظر دوڑانا، آگ میں نظر جھونکنے کے برابر ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اگر ماں چاہتی ہے کہ میں اپنے بچوں پر نظر رکھوں تو کیا وہ ان کی چیزیں بغیر اجازت دیکھ سکتی ہے۔ جی ہاں! لیکن اس میں مناسب بات یہ ہے کہ وہ اپنے بچوں کو اعتماد میں لے اور سب کو اُن کے معیار کے مطابق اچھائی اور بُرائی سے آگاہ کرے اور بچوں کو بتادے: ''میں جب چاہوں گی، تمہارے بستے دیکھوں گی، الماری چیک کروں گی، تمہارا موبائل چیک کروں گی۔''

سسرال کی باتیں امانت ہیں:

اگر آپ کے سسرال میں سب اکٹھے رہتے ہیں۔ دس طرح کی باتیں ہوتی ہیں، کبھی اونچ نیچ ہو جاتی

ہے، نند اور ساس میں تلخ کلامی ہوجاتی ہے غرض جتنا بہو کو پتا ہوتا ہے، اتنا کسی اور کو نہیں پتا ہوتا اور وہ اپنے سسرال کا سب اگلا پچھلا جانتی ہے۔ لیکن دھیان رہے کہ سسرال کی باتیں امانت ہیں۔ ان کو میکے میں جا کر بتانا بددیانتی ہے اور بہت بڑی خیانت ہے۔ ہر گھر میں ایسے معاملات ہوتے رہتے ہیں، سب کی کچھ نہ کچھ کم زوریاں ہوتی ہیں۔ سب کے معاملات میں بناؤ اور بگاڑ آتے رہتے ہیں۔ ان باتوں سے زیادہ دل چسپی نہ رکھیں اور نہ انھیں کہیں جا کر موضوعِ سخن بنائیں ورنہ یہ تو گھر کا بھیدی لنکا ڈھائے والا معاملہ ہوجائے گا۔

میکے کی امانت:

اسی طرح میکے کی باتیں سسرال آ کر نہ بتائیں، سوائے مشورہ کی غرض سے، اس کی گنجائش ہے کہ کوئی مشورہ درکار ہو۔ بعض دفعہ انسان کو کسی پر بھروسا ہوتا ہے اور ہوسکتا ہے کوئی عورت سسرال اور میکے کا لحاظ نہ رکھتے ہوئے اُسے شریکِ خیال کرتی ہو، اُسی سے مشورہ لیتی ہو یہ اور چیز ہے۔ اسی طرح اگر کسی کو خود اپنی ساس پر بھروسا ہو اور وہ اپنے میکے کے کچھ معاملات ساس کو بتا کر اُس سے مشورہ لینا چاہتی ہو تو یہ اور بات ہے۔ لیکن سسرال میں بیٹھ کر کھلم کھلا اپنی بھابھیوں کی بُرائیاں کرنا یہ چیز مناسب نہیں ہے۔

تاک جھانک کی خیانت:

کسی کے گھر میں جھانکنا بھی خیانت ہے۔ بعض لوگوں کی عادت ہوتی ہے کہ راہ چلتے چلتے بے اختیار گھر میں جھانک لیتے ہیں۔ یہ کسی طرح بھی مناسب نہیں۔

نوکروں کے ذریعے کسی کے گھر کے حالات معلوم کرنا:

نوکروں کے ذریعے بھی لوگوں کے گھروں کے حالات دریافت کیے جاتے ہیں۔ چوں کہ کام کرنے والیاں آس پاس کئی گھروں میں کام کرتی ہیں۔ اب ان سے پوچھنا ''پڑوس میں کیا چل رہا ہے'' یہ بھی خیانت ہے۔ آپ نے ایک طرح سے اس عورت کو گناہ پر آمادہ کیا اور اُس نے کسی کا بھروسا توڑا، یا پھر مشترکہ خاندانی نظام میں ایک کام کرنے والی گھر میں سب کا کام کرتی ہے۔ اس سے پوچھنا کہ دیورانی یا ساس کیا کیا کر رہی تھیں یا کیا باتیں کر رہی تھیں۔ یہ سب باتیں بھی خیانت میں چلی جائیں گی۔

مسجد نبوی سے چوری:

مسجد نبوی میں ہر زبان کے قرآن مجید رکھے ہوتے ہیں۔ کسی نے بتایا ہے کہ اب وہاں ترجمے والے قرآن نہیں رکھے جاتے، کیوں کہ بہت سے لوگ اپنی اپنی زبان والے ترجمے اُٹھا کر ساتھ لے جاتے تھے۔ بغیر اجازت کسی بھی چیز کا اُٹھا لینا چوری شمار ہوتا ہے کجا مسجد نبوی سے چوری کرنا! یہ تو اللہ کے غضب کو دعوت دینے والی بات ہے۔ کتنی عبرت کی بات ہے کہ رحمت للعالمین ﷺ کی

مسجد میں گئے اور وہاں سے اللہ کا غضب لے کر لوٹے۔ وہ مصاحف امانت تھے۔ انہوں نے اس نیت سے رکھے تھے کہ لوگ یہ قرآن یہیں پڑھیں گے اور پھر رکھ کر چلے جائیں گے۔

سب سے بڑی خیانت:

اور ہم سب سے بڑی خیانت اللہ کے ساتھ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ہم سے عہد لیا تھا۔

{اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰى شَهِدْنَا} (سورۃ اعراف: ۱۷۲)

''کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ ہم سب نے کہا تھا کیوں نہیں! ہم گواہ ہیں۔''

اس گواہی کے باوجود شرک کرنا یا اللہ کو اللہ کا حق نہ دینا، یہ بھی یقیناً خیانت کی بدترین شکل ہے۔

اساتذہ کی خیانت:

کوئی ٹیچر وقت کی پابندی کا خیال نہیں رکھتا۔ سرکاری درس گاہوں میں اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اسکول موجود ہے لیکن اساتذہ نہیں آتے۔ تنخواہیں لیتے ہیں، سہولیات بھی استعمال کرتے ہیں مگر سرکار کی طرف سے جو ذمہ داری سونپی گئی ہے اور جس ذمہ داری نبھانے کا انھوں نے وعدہ بھی کیا ہے، اُس کا کوئی احساس نہیں کہ ہم خیانت کر کے گناہ گار ہو رہے ہیں۔

بدقسمتی سے ہمارے ہاں یہ فضا بہت عام ہے۔ اپنی ذمہ داری، اپنے عہدے اور وعدے کی نزاکت محسوس نہ کرنا اور اس کا حق ادا نہ کرنا۔ بہت سے لوگ چھٹی لینے کے لیے ڈاکٹروں سے جعلی سرٹیفکیٹ لکھوا کر لے آتے ہیں۔ فون کر کے بیماری کا بہانہ بنا دیتے ہیں اور کسی ذاتی کام میں مصروف ہو جاتے ہیں۔ دفتر سے غائب ہو جاتے ہیں۔ یہ جھوٹ بھی ہے، خیانت بھی ہے اور دھوکا بھی ہے۔ بیمار نہیں ہوتے، مگر دفتر فون کر کے کہہ دیتے ہیں کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں، میں نہیں آؤں گا اور گھر پر رہ کر کوئی ذاتی کام کر لیتے ہیں۔ یہ صریح جھوٹ ہے۔

ہمیں پورے شعور کے ساتھ خیانت کا احساس کرنا ہوگا۔ خیانت کے کئی پہلو ہیں اور نہ صرف مال و اسباب بلکہ افکار و خیالات میں بھی خیانت ہوتی ہے۔ تبھی تو قرآن میں الفاظ آتے ہیں:

{يَعْلَمُ خَآئِنَةَ الْاَعْيُنِ وَمَا تُخْفِي الصُّدُوْرُ} (المؤمن: ۱۹)

''اللہ تو جانتا ہے نظروں کی خیانت اور دل جو چھپاتے ہیں۔''

نامحرم کو دیکھنا نظروں کی خیانت ہے اور نامحرم کے بارے میں سوچنا اُس کے تصور سے لطف اندوز ہونا، ذہن کی خیانت ہے۔ خیانت کی ہر صورت سے بچنے کی ضرورت ہے۔ اللہ تعالیٰ سے بہت دُعا کرتے رہنا چاہیے کہ اللہ ہمیں امانت دار بنا دے۔ ایمان دار بنا دے اور عہد کی پابندی کرنے والا بنا دے۔ آمین!